ستمبر - اکتوبر ۱۹۶۲ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

زیر ادارت

امین احسن اصلاحی

مشترکہ شمارہ کی قیمت: نوے پیسے
قیمت فی پرچہ: ساٹھ پیسے
سالانہ: چھ روپے (بارہ شلنگ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

ہمارے مختلف مذہبی گروہوں اور فرقوں کے درمیان تکفیر و تفسیق اور اختلاف و خناد کی آگ یوں تو برابر ہی سلگتی رہی ہے بلکہ وقتاً فوقتاً بھڑکتی بھی رہی ہے لیکن ان دنوں بعض پرجوش حضرات کی دراندازی سے یہ جس شان سے بھڑکی ہے اس کو دیکھ کر یہ خطرہ بالکل سامنے نظر آرہا ہے کہ اگر اللہ کے کچھ نیک بندوں نے اس پر جلد سے جلد قابو پانے کی کوشش نہ کی تو یہ آگ نہ صرف ہمارے ملک کے سارے امن و امان کو تباہ کر کے رکھ دے گی بلکہ اندیشہ اس بات کا بھی ہے کہ خدانخواستہ یہ سرے سے یہاں سے مذہب ہی کا صفایا کر دے۔ صرف نادان ہی ہوں گے جو اس حقیقت سے بے خبر ہوں گے کہ ہمارے ملک میں مخالفِ مذہب عنصر بہت قوی اور با اختیار ہے اور وہ برابر اس گھات میں لگا ہوا ہے کہ جہاں کوئی موقع پائے اس سے فائدہ اٹھا کر اس دردسر سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل کرلے جس سے اسے مذہبی گروہوں کے مطالبات کے باعث بار بار دوچار ہونا پڑ رہا ہے ہمارا اندازہ ہے کہ اس وقت اس فتنہ نے جو خوفناک شکل اختیار کرلی ہے وہ بڑی آسانی سے وہ بہانہ پیدا کر دے سکتی ہے جس کی آڑ لے کر مذہب اور مذہبی تحریکات پر وہ ضرب لگائی جا سکے جس کے بعد ایک مدت دراز تک شاید یہاں دین کے نام سے کوئی کام کرنے کا موقع ہی باقی نہ رہ جائے۔

ہم یہ بات بڑے غم کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں کہ ہمارے علماء حضرات اشخاص کے پہچاننے کے معاملہ میں بڑی سادہ لوحی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ ایک صاحب مشرقی پاکستان سے قوم اور ملک کے نجات دہندہ بن کر تشریف لائے اور بعض اچھے خاصے سمجھدار لوگوں کو بے وقوف بنا کر چلے گئے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں دیوبندی اور بریلوی حضرات میں جو کشمکش چلی آرہی تھی اس میں ایک صاحب قلم کی شمولیت نے دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے ان دونوں مذہبی گروہوں کو اس طرح دست و گریبان کر دیا ہے کہ خدا ہی جانتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ حالانکہ ایک موٹی عقل کا آدمی بھی یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ ہمارے مذہبی گروہوں کے درمیان جو اختلاف ہے اس کو اب کسی کے زورِ قلم یا زورِ بیان سے قیامت تک دبایا نہیں جا سکتا بلکہ اگر ان میں سے کسی فتنہ کو زورِ بیان یا زورِ قلم سے دبانے کی کوشش کی گئی تو جو چیز آج رائی کی حیثیت رکھتی ہے وہ کل پربت بن کر رہے گی۔ لیکن ہمیں یہ دیکھ کر بڑا صدمہ ہوتا ہے کہ آج بھی ایسے خوش فہم لوگ موجود ہیں جو اینٹ کا جواب پتھر سے دے کر اپنے حریفوں کو مغلوب کرنے کے خبط میں مبتلا ہیں۔

اس بات کے ظاہر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ جہاں تک بریلوی حضرات کی طرف سے علمائے دیوبند اور حضرت اسماعیل شہیدؒ وغیرہ کی تکفیر کا تعلق ہے اس سے ہر سلیم الفطرت مسلمان کی روح کو اذیت ہوتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس کا علاج کیا ہے؟ ہمارے نزدیک اس کا واحد علاج یہی ہے کہ اس چیز کو نظر انداز کیا جائے اور اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی بجائے اپنے اچھے طرزِ عمل سے مخالف کے سامنے ایک اچھی مثال پیش کی جائے۔ اس سے بالفرض کوئی فائدہ نہ بھی ہو تب بھی یہ امر تو اپنی جگہ پر واضح ہے کہ اس سے کوئی بڑا نقصان نہیں پہنچے گا اور یہ فائدہ کوئی معمولی فائدہ نہیں ہے۔

اب جو فرقے مسلمانوں میں پیدا ہو چکے ہیں ان میں سے کسی کو مٹا دینا کسی انسان کے بس کا کام نہیں ہے۔ ان میں سے کوئی مٹے گا تو خدا ہی کے مٹانے سے مٹے گا اب

تو یہ دعا کرنی چاہیئے کہ ہمارے اندر کسی اور نئے فرقے کا اضافہ نہ ہو۔ اس وقت سوچنے اور کرنے کا کام یہ ہے کہ ان اختلافات کے اندر کوئی ایسی شکل اختیار کی جائے کہ ہماری قوم اجتماعی مقاصد میں متحد بھی رہ سکے۔ ظاہر ہے کہ اگر اس اتحاد کی کوئی راہ نکل سکتی ہے تو اسی طرح نکل سکتی ہے کہ مختلف گروہوں کے سربراہ اپنے اپنے گروہوں کے اندر رواداری کی اسپرٹ اور ملی وحدت کا شعور پیدا کرنے کی کوشش کریں اور ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق کے سلسلہ کو بالکل بند کر دیں۔ جو مسائل اختلافی نوعیت کے ہیں ان پر اگر بحث مباحثہ بند کرنا ممکن نہ ہو تو کم سے کم یہ روش اختیار کی جائے کہ انداز بحث علمی اور تحقیقی ہو مناظرانہ اور مجادلانہ نہ ہو۔ ہم قوم کے تمام دردمندوں سے اپیل کرتے ہیں کہ جو حضرات کسی نوعیت سے بھی ہمارے دونوں متحارب گروہوں پر اثر انداز ہو سکتے ہوں وہ آگے بڑھیں اور حالات کو مزید بگڑنے سے روکنے کی جو کوشش ان کے امکان میں ہے اس سے دریغ نہ کریں۔

آخر میں ہم حکومت سے بھی یہ درخواست کریں گے کہ وہ بھی اس امر کا انتظار نہ کرے کہ یہ مسئلہ لا اور آرڈر کا مسئلہ بن جائے تب ہی وہ اس میں مداخلت کرے بلکہ وہ پہلے اصلاح حال کے ان ذرائع کو استعمال کرے جو لوگوں کے ذہنوں اور دماغوں کو تبدیل کرنے میں مددگار ہو سکیں ہمیں امید ہے کہ یہ طریقہ زیادہ مؤثر اور مفید ہوگا اور حکومت کو لا اور آرڈر کے قیام کے لئے کوئی سخت اقدام کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ان بھائیوں کو جو نہایت غلط قسم کے جھگڑے میں الجھ گئے ہیں جذبات کی بجائے عقل سے کام لینے کی توفیق دے اور وہ دین اور اہلِ دین کی مزید رسوائی کا سبب نہ بنیں۔

تدبر قرآن

امین احسن اصلاحی

تفسیر سورہ بقرہ

(۲۸)

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ | اسلام کے معنی اپنے آپ کو پورے طور پر خدا کی مرضی اور اس کے احکام کے حوالہ کر دینا ہے۔ یہاں ہمارے نزدیک اس سے بیٹے کی قربانی کی طرف اشارہ ہے۔ یوں تو وہ تمام امتحانات جن سے وہ گزارے گئے، ان کے اسلام کی جانچ ہی کے لئے تھے، گویا ہر امتحان زبانِ حال سے ان کے سامنے "اَسْلِمْ" ہی کا مطالبہ رکھنے کے لئے نمودار ہوا لیکن خاص طور پر حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کا حکم جس میں کامیابی کے بعد وہ برگزیدگی اور امامت کی عزت سے نوازے گئے ہیں، کامل سپردگی اور کامل حوالگی کا ایک ایسا مطالبہ تھا جس کی تعبیر کے لئے سب سے زیادہ جامع اور حقیقت افروز لفظ اگر کوئی ہو سکتا تھا تو "اَسْلِمْ" ہی کا لفظ ہو سکتا تھا۔ یہ لفظ واقعہ قربانی کی طرف اشارہ کرنے کے لئے قرآن مجید میں بعض دوسرے مقامات میں بھی آیا ہے، مثلاً۔ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۱۰۳- صافات (پس جب باپ اور بیٹے دونوں نے اپنے آپ کو اپنے رب کے حوالہ کر دیا اور ابراہیم نے اسمٰعیل کو پیشانی کے بل پچھاڑ دیا)

یہاں اس واقعہ کی طرف اسلام کے لفظ سے اشارہ کر کے قرآن نے کئی حقیقتیں واضح کی ہیں۔ ایک تو یہ کہ حضرت ابراہیم کو اللہ تعالےٰ نے دنیا اور آخرت دونوں میں جو برگزیدگی بخشی وہ، جیسا کہ آیت ۱۲۴ میں اشارہ ہو چکا ہے، ان کی ان جان بازیوں

اور قربانیوں کا صلہ ہے جو انھوں نے رب کی رضا طلبی کی راہ میں کیں۔ یہ عظمت ان کو مفت میں نہیں حاصل ہوئی جس طرح یہود اس کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کو کامل سپردگی اور کامل حوالگی یعنی اسلام کا حکم ہؤا تھا اور انہوں نے اپنے قول و عمل سے اسی اسلام کا مظاہرہ کیا نہ کہ یہودیت یا نصرانیت کا جیسا کہ یہود یا نصاریٰ گمان کرتے ہیں۔ تیسری یہ کہ اسلام کی اصل روح اپنے آپ کو اپنے رب کے حوالہ کر دینا ہے یہاں تک کہ کوئی عزیز سے عزیز چیز بھی بندے کے نزدیک خدا سے زیادہ عزیز نہ رہ جائے۔

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهِيْمُ بَنِيْهِ ...... فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ | توصیہ کے معنی تعلیم و تلقین کرنے کے ہیں، عام اس سے کہ یہ تعلیم و تلقین کوئی شخص اپنی وفات کے وقت کرے یا زندگی کے کسی دوسرے مرحلہ میں۔

"بِهَا" میں ضمیر ملت اسلام کے لئے ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں ملۃ ابراھیم کے لفظ سے ہؤا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی اس وصیت کا ذکر اگرچہ یہود کے صحیفوں میں کہیں نہیں ملتا لیکن ظاہر ہے کہ دین کے معاملہ میں اپنی اولاد اور اپنے اتباع کو وصیت و نصیحت انبیاء علیہم السلام کی عام سنت رہی ہے۔ بنی اسرائیل و بنی اسمٰعیل کے عام بزرگان خاندان اور سرداران قبائل سے متعلق بھی اس طرح کی تلقین و نصیحت کی بکثرت روایات منقول ہیں۔ یہاں تک کہ تالمود میں ایک وصیت حضرت یعقوبؑ کی بھی قرآن مجید کی بیان کردہ وصیت سے ملتی جلتی موجود ہے۔ خاندانوں اور ملتوں میں اس طرح کی روایات خاندانوں کے اکابر ہی کے طرزِ عمل سے قائم ہوتی ہیں۔ اس وجہ سے یہ بات بالکل قرین قیاس ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خود اپنے طرزِ عمل سے اپنے بعد والوں کے لئے یہ سنت چھوڑی ہو۔ رہی یہ بات کہ انہوں نے اپنی اولاد کو ملتِ اسلام کی وصیت کی تو یہ اس قدر واضح ہے کہ اس کے لئے کسی مزید دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ اوپر ان کی جو سرگزشتِ حیات بیان ہوئی ہے اس سے یہ واضح ہے کہ وہ جس ملت سے آشنا ہوئے، جس ملت کی انہوں نے دعوت دی اور اپنی عظیم قربانی

سے جس ملت کی حقیقت کا انھوں نے مظاہرہ کیا، وہ اسلام ہے، تو پھر وہ اس ملت کو چھوڑ کر اپنی اولاد کو یہودیت یا نصرانیت کی تلقین کس طرح کرتے جن سے وہ سرے سے آشنا ہی نہیں ہوئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ حضرت یعقوبؑ کا ذکر یہاں اس خصوصیت کی وجہ سے ہؤا کہ بنی اسرائیل براہ راست انہی کی اولاد تھے۔ مطلب یہ ہؤا کہ روایت اگر ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے نیچے تین پشتوں تک برابر ملتِ اسلام ہی کی وصیت کی ہے نہ کہ یہودیت و نصرانیت کی، تو ملتِ ابراہیمی کی پیروی کے مدعیوں کے لئے پیروی کی چیز اسلام ہے یا یہودیت اور نصرانیت؟

اَلدِّیْن سے مراد وہ دین حقیقی ہے جو شروع سے اللہ کا دین ہے یعنی اسلام، چنانچہ دوسری جگہ فرمایا ہے۔ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۱۹۔ آل عمران (حقیقی دین اللہ کے نزدیک اسلام ہے) ایک جگہ ارشاد ہے۔ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۸۳۔ آل عمران (کیا وہ اللہ کے دین کے سوا کسی اور دین کے طالب ہیں، حالانکہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں طوعاً یا کرہاً سب اسی کے مطیع ہیں اور سب اسی کی جانب لوٹیں گے) یہی دین اللہ کا دین ہے اور یہی دین اس نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے ہمیشہ بھیجا۔ اسی دین کی پیروی اور اسی پر جینے اور مرنے کی وصیت حضرت ابراہیمؑ و حضرت یعقوبؑ نے اپنی اپنی اولاد کو فرمائی لیکن بعد میں بنی اسرائیل نے اس میں تحریف کر کے اس کا حلیہ بگاڑ ڈالا اور اس کی جگہ یہودیت و نصرانیت کے فتنے کھڑے کر دیئے۔

فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (پس تم نہ مرنا مگر حالت اسلام پر)۔ اس میں یہ مضمون پوشیدہ ہے کہ اس دین کی امانت ایک بھاری امانت ہے، اس امانت کا حق تمہیں عہد سے لے کر لحد تک ادا کرنا ہے، اس راہ میں بڑی بڑی آزمائشیں پیش آنی ہیں اور تمہیں ان آزمائشوں کا پورے عزم و ہمت سے مقابلہ کرنا ہے، خیال رکھنا شیطان تمہیں کسی مرحلہ میں اس مقام سے ہٹانے نہ پائے۔ تمہیں اسی کے لئے جینا اور اسی کے لئے

مرتا ہے۔

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ ..... وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ | یہ سوال کا انداز مخاطب کو متنبہ کرنے اور تقریر کو زیادہ مؤثر بنانے کے لئے اختیار فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم دعوے کرتے ہو کہ تمہارے بزرگ آباواجداد یہودیت یا نصرانیت پر تھے تو کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب علیہ السلام کا آخری وقت آیا اور انھوں نے اپنے بیٹوں کو وصیت کے لئے بلایا تھا۔ اس وقت انھوں نے ان سے کس چیز کا اقرار لیا۔ توحید اور اسلام کا یا یہودیت اور نصرانیت کا؟ اس سوال کے بعد قرآن نے حضرت یعقوب علیہ السلام کا اپنے بیٹوں سے سوال اور ان کے بیٹوں کا متفقہ جواب نقل کیا ہے جو صاف صاف دینِ توحید اور اسلام کے حق میں ہے یہود کے لٹریچر میں بھی اس وصیت سے متعلق جو روایت ملتی ہے اس کے الفاظ اگرچہ قرآن کے الفاظ سے کچھ مختلف ہیں لیکن ان سے تائید بہر حال قرآن ہی کے بیان کی نکلتی ہے نہ کہ بنی اسرائیل کے مذکورہ دعوے کی۔ اس لئے کہ اس میں یہودیت یا نصرانیت کی طرف کوئی اشارہ بھی موجود نہیں ہے[1]۔

---

[1] ہمارے مخدوم مولانا عبدالماجد دریابادی نے یہود کے لٹریچر سے تلاش کرکے اس موقع پر اپنی تفسیر میں دو حوالے نقل کئے ہیں، ایک حضرت اسحاق کی وصیت سے متعلق ہے، دوسرا حضرت یعقوبؑ کی وصیت سے متعلق۔

"جب اسحاق نے دیکھا کہ اس کا وقت موعود آپہنچا تو انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں کو اپنے پاس بلایا اور کہا کہ میں تمہیں خدائے تعالیٰ کا واسطہ دیتا ہوں جس کی صفات اعلیٰ، عظیم، قیوم، العزیز ہیں۔ اور جو آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی ہر چیز کا خالق ہے کہ تم خوف اسی کا رکھنا اور عبادت اسی کی کرنا۔" گنزبرگ کی قصص یہود جلد اول ص ۴۱۶

"یعقوب نے اپنے بیٹوں سے کہا مجھے اندیشہ ہے۔ کہ تم میں سے کوئی بت پرستی کا میلان رکھتا ہے۔ اس کے جواب میں بارہ بیٹوں نے کہا، سن اے اسرائیل، اے ہمارے باپ، ہمارا خدا وہی خدائے لم یزل ہے۔ جس طرح تیرا دلی ایمان ایک خدا پر ہے، اسی طرح ہم سب کا دلی ایمان ایک خدا پر ہے۔" گنزبرگ کی قصص یہود جلد ۲ ص ۱۴۱

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ قرآن نے خاص طور پر حضرت یعقوب علیہ السلام کے موت کے وقت کی وصیت کا حوالہ دیا ہے جس سے کئی باتوں کی طرف اشارہ مقصود ہے، ایک تو اس بات کی طرف کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ عہد و اقرار اپنی اولاد سے اپنے بالکل آخری لمحاتِ زندگی میں لیا ہے اس وجہ سے یہ گمان کرنے کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اس کے بعد ان کے مسلک و مذہب میں کوئی تبدیلی واقع ہوگئی ہو۔ دوسری اس بات کی طرف کہ ایک شفیق و مہربان باپ، جو خدا کا ایک پیغمبر بھی ہے، اپنی اولاد سے جو عہد و اقرار اپنے بالکل آخری لمحاتِ زندگی میں لیتا ہے، اس کے اور اس کی اولاد کے درمیان سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والا واقعہ وہی عہد و اقرار ہو سکتا ہے اور باوفا اولاد کا یہ سب سے بڑا اور سب سے مقدس فرض ہے کہ وہ ہر طرح کے حالات کے اندر اس عہد کو نباہے۔ صرف ناخلف اولاد ہی کسی اس نوعیت کے عہد و اقرار کی خلاف ورزی کرتی ہے تیسری یہ کہ اللہ سے ڈرنے والے اور اپنی اولاد سے سچی محبت کرنے والے ایک باپ کا زندگی میں اپنی اولاد سے متعلق آخری فریضہ یہ ہے کہ وہ مرتے دم ان کی دنیا سے زیادہ ان کی آخرت کی فکر کرے اور ان کو دینِ حق پر قائم رہنے اور اسی دین پر جینے اور مرنے کی ان کو تلقین کرے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام نے مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ (تم میرے بعد کس چیز کی عبادت کروگے) میں سوال کے لئے مَا کا لفظ استعمال کرکے سوال میں زیادہ سے زیادہ وسعت پیدا کر دی تاکہ جواب دینے والوں کے ذہن میں معبود سے متعلق اگر کوئی تردد ہو تو وہ اس سوال کے جواب میں ظاہر ہو جائے لیکن ان کے بیٹوں کا جواب واضح کرتا ہے کہ اس وقت تک ان کے ذہن میں معبود سے متعلق کوئی الجھن موجود نہیں تھی، انھوں نے نہایت واضح الفاظ میں اس کی توحید کا بھی اقرار کیا اور اسی کو سزاوار عبادت اور سزاوار اطاعت بھی قرار دیا ہے۔

اس آیت میں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ حضرت یعقوب کی اولاد نے اس موقع پر جس احساس فخر و اعتماد کے ساتھ حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے آباواجداد میں گنایا ہے اسی فخر و اعتماد کے ساتھ انہوں نے حضرت اسمٰعیل کا بھی حوالہ

دلیل ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت یعقوبؑ کے زمانے تک ان کی اولاد کے اندر حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی ذریت کے خلاف وہ تعصبات نہیں پیدا ہوئے تھے جو بعد میں پیدا ہو گئے۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ...... عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ | یہ آیت اس سلسلۂ بیان میں دو مرتبہ آئی ہے۔ ایک یہاں، پھر چند ہی آیات کے بعد پارے کے خاتمے پر جہاں یہ سلسلۂ بیان ختم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہی وہ خلاصۂ بحث ہے جو مخاطب کے سامنے رکھنا مقصود ہے۔ بتانا یہ ہے کہ تمہارا سارا فخر و اعتماد اپنے باپ دادا پر رہ گیا ہے، تم سمجھتے ہو کہ تمہارے حصے کے اعمال بھی وہ انجام دے گئے، اب تمہیں صرف ان کی نیکیوں کے پھل کھانے ہیں، تمہارے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں رہ گئی ہے۔ یہ فخر و اعتماد بالکل وہم و خیال پر مبنی ہے، انہوں نے اپنے حصے کی ذمہ داریاں انجام دی ہیں اور ان ذمہ داریوں کو انجام دے کر اپنے رب کے پاس پہنچ چکے ہیں، وہ اپنی نیکیوں کا صلہ خود پائیں گے، اس کا کوئی حصہ بھی تمہیں ملنے والا نہیں ہے، تمہاری ذمہ داریاں تمہارے اوپر ہیں، اگر تم ان کو انجام دو گے تو ان کا صلہ پاؤ گے، ورنہ ان کی سزا بھگتو گے۔ خدا کے ہاں تم سے تمہارے آباؤ اجداد کے اعمال سے متعلق پرسش نہیں ہونی ہے بلکہ خود تمہارے اپنے اعمال سے متعلق پرسش ہونی ہے۔

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا ...... وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ | اوپر آیت ۱۱۱ کی وضاحت کرتے ہوئے ہم بیان کر چکے ہیں کہ اسلام کی مخالفت کے جوش میں یہود اور نصاریٰ دونوں متحد ہو کر یہ بات کہتے تھے کہ آدمی ہدایت اور نجات کا طالب ہو تو یہودیت اختیار کرے یا نصرانیت، یہ دونوں خدائی دین ہیں، یہ تیسرا دین، جو اسلام کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے یہ بھلا کیا ہے؟

جواب میں فرمایا۔ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا۔ (کہہ دو، بلکہ ملت ابراہیم کی پیروی کرو جو یکسو تھا) ملت کا لفظ یہاں حالت نصب میں ہے اس وجہ سے لازماً یہاں کوئی فعل محذوف ماننا پڑے گا۔ عام طور پر لوگ یہاں ماضی کا صیغہ محذوف مانتے ہیں۔ یعنی کہو ہم نے پیروی کی ملت ابراہیم کی۔ ہم نے یہاں امر کا صیغہ محذوف مانا ہے اور ترجمہ میں اسی کا لحاظ کیا

ہے۔ ہمارے نزدیک اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہاں یہ جواب جیسا کہ لفظ قُلْ سے واضح ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے دلوایا گیا ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بالخصوص اہل کتاب کی گمراہ کن دعوت کے جواب میں دعوت ہی کا خطاب موزوں تھا۔ دوسری یہ کہ مسلمانوں کی زبان سے اپنے ایمان و اسلام کا بیان آگے والی آیت میں قُوْلُوْا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ الآیۃ کے الفاظ سے آ رہا ہے، اس وجہ سے اس آیت کو دعوت ہی کے مفہوم میں لینا زیادہ مناسب ہے۔ تیسری یہ کہ عربی زبان میں جب اس طرح منصوب آتا ہے تو اس کا مزاج مخاطب کو کسی بات پر ابھارنے یا اس کو کسی چیز سے ڈرانے کے موقع و محل سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے جس کے لئے امر کا صیغہ زیادہ موزوں ہے۔

حنیفًا حنف سے ہے جس کے اصل معنی مائل ہونے اور جھکنے کے ہیں۔ حنیف اس شخص کو کہتے ہیں جو ہر طرف سے کٹ کر پوری یکسوئی کے ساتھ خدا کا ہو رہے۔ یہاں یہ لفظ ابراہیم سے حال پڑا ہوا ہے۔ اگرچہ ابراہیم حالت جر میں ہے اور مجرور سے حال پڑنے کے معاملہ میں اہل نحو بہت متردد ہیں، لیکن مولانا فراہیؒ نے اپنی تفسیر سورۂ فیل میں نہایت قوی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ عربی زبان میں یہ طریقہ معروف ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے حنیف کی صفت قرآن مجید نے بار بار استعمال کی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہود، نصاریٰ اور مشرکین سب ان کو اپنا روحانی پیشوا مانتے تھے اور ان تینوں ہی گروہوں کا یہ دعوےٰ تھا کہ وہ جس مذہب پر ہیں یہ حضرت ابراہیمؑ ہی کی وراثت ہے۔ قرآن مجید نے مختلف دلائل سے پہلے ان کے اس دعوے کی تردید کی، پھر فرمایا کہ ابراہیمؑ حنیف تھے، وہ خدا کی قائم کردہ صراط مستقیم — ملت اسلام — سے سر مو ادھر ادھر نہیں ہوئے، نہ وہ یہودیت اور نصرانیت کی پگڈنڈیوں کی طرف مڑے، نہ مشرکین کی ضلالتوں میں مبتلا ہوئے بلکہ برابر اسلام کی اسی شاہراہ پر قائم رہے جو خدا نے کھولی تھی اور جو خدا تک پہنچانے والی واحد سیدھی راہ تھی۔

قُوْلُوْا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ...... لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ | یہ یہود و نصاریٰ کی اس دعوت کا کہ یہودی یا نصرانی بنو تو ہدایت پاؤ گے، مسلمانوں کی طرف سے جواب

ہے کہ تم کہہ دو کہ ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اللہ کی اس ہدایت پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر اتری ہے اور جو ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ اور اولادِ یعقوب کی مختلف شاخوں پر ان کے انبیاءؑ کے واسطے سے اتری ہے اور اس ہدایت پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو موسیٰؑ و عیسیٰؑ اور دوسرے انبیاء کو ان کے رب کی جانب سے ملی، ہم ان انبیاءؑ کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے اور ہم صرف اللہ ہی کے فرمانبردار ہیں۔

خدا کی شریعت اور اس کے نبیوں اور رسولوں کے باب میں یہ امتِ مسلمہ یا امتِ وسط کا موقف یا بالفاظِ دیگر کلمہ بیان ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ امت خدا کی اتاری ہوئی کسی ہدایت کی نہ تو تردید کرتی اور نہ کسی نبی یا رسول کی تکذیب کرتی بلکہ بغیر کسی تفریق و استثنا کے سب پر ایمان رکھتی ہے۔ اس کا کہنا اگر ہے تو یہ ہے کہ خدا کے ان نبیوں اور رسولوں نے اپنی اپنی امتوں کو جو تعلیمیں دی تھیں ان کی امتوں نے ان میں یا تو ملاوٹ کر دی یا ان کے کچھ حصّہ کو فراموش کر دیا، اب اس امت کو جو شریعت ملی ہے وہ خدا کی اصل ہدایت کو اس کی آخری اور مکمل شکل میں پیش کرتی ہے۔

آیت میں اسباط کا لفظ سبط کی جمع ہے۔ اس کا لغوی مفہوم بڑھنے اور پھیلنے کا ہے اسی مفہوم کے لحاظ سے ایک باپ کی اولاد اور ان کی مختلف شاخوں کے لئے اس کا استعمال ہوا اور نسلِ یعقوبؑ کی مختلف شاخوں کے لئے تو اس کا استعمال اس قدر معروف ہے کہ معلوم ہوتا ہے انہی کے لئے وضع ہوا ہے۔

"لانفرق بین احد منھم" (ہم ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے) کا مطلب یہ ہے کہ ہم یہود و نصاریٰ کی طرح یہ نہیں کرتے کہ ان میں سے کسی پر ایمان لائیں اور کسی پر ایمان نہ لائیں۔ اس مطلب کی وضاحت خود قرآن نے دوسری جگہ کر دی ہے۔ يُرِيدُونَ أَن يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَن يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ۔ ۱۵۰۔ نساء (اور وہ چاہتے ہیں کہ تفریق کریں اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ اس کے بیچ میں کوئی راہ پیدا کریں) اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء میں سے کسی کو ماننا اور کسی

کو نہ ماننا سب کے انکار کے ہم معنی ہے اور یہ صرف نبیوں اور نبیوں ہی میں تفریق نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول میں بھی تفریق ہے۔

فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنتُم بِهِ ...... وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ | یعنی اگر یہی کلمۂ جامعہ وہ بھی قبول کر لیں جس طرح تم تمام انبیاء اور تمام ہدایتوں پر ایمان لائے ہو اسی طرح یہ بھی ایمان لائیں تو بلاشبہ وہ راہ یاب ہوں گے۔ راہ یاب ہونے کا راستہ یہودی یا نصرانی ہونا نہیں ہے، جیسا کہ یہود و نصاریٰ دعوے کرتے ہیں، بلکہ اس کا راستہ وہ ہے جو تم نے اختیار کیا ہے۔ یعنی تمام نبیوں اور تمام رسولوں پر بلا کسی تفریق و تعصب کے ایمان لانا۔ اور اگر وہ اس چیز سے انکار کرتے ہیں تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ تمہاری مخالفت کے درپے ہیں، اور اتحاد و اتفاق کی راہ کو چھوڑ کر یہ اللہ اور اس کے رسولوں کے خلاف اپنی ایک الگ پارٹی کھڑی رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر یہ بات ہے تو انہیں ان کی اختیار کی ہوئی راہ پر چلنے دو، ان کے مقابلہ کے لئے تمہاری طرف سے اللہ کافی ہے۔ آخر میں اپنی صفات سمیع و علیم کا حوالہ دینے کا مقصد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان دلانا ہے کہ تمہاری مخالفت میں یہ جو سازشیں اور جو ریشہ دوانیاں بھی کریں تم ان سے مطلق ہراساں نہ ہو، جو خدا تمہاری طرف سے ان سے لڑنے کھڑا ہوا ہے وہ سب کچھ سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔

صِبْغَةَ اللَّهِ ...... وَنَحْنُ لَهُ عَابِدُونَ | یہود و نصاریٰ کو مخاطب کر کے دعوت دی گئی ہے کہ اگر اپنے آپ کو اللہ کے رنگ میں رنگنا چاہتے ہو تو یہودیت و نصرانیت کو چھوڑ کر یہ اللہ کا رنگ اختیار کرو۔ یہ کلمہ جامعہ جس کا اوپر ذکر گزرا، اپنے اندر اللہ کی تمام ہدایتوں اور اس کے تمام نبیوں اور تمام رسولوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ کلمہ ہے جس سے زندگی پر خدا کا اصل رنگ چڑھتا ہے، پس اگر زندگی کو خدا کے رنگ میں رنگنا ہے تو اس رنگ میں رنگو، اس رنگ سے بڑھ کر کس کا رنگ ہو سکتا ہے! اس میں یہود و نصاریٰ کے بپتسمہ کی طرف ایک تعریض بھی ہے اور بغیر کسی فعل کے لفظ صبغہ کا منصوب ہونا ہمارے نزدیک اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں کوئی ایسا صیغہ محذوف جانا جائے جو ابھارنے اور جوش دلانے کے مضمون پر مشتمل ہو۔

قُلْ أَتُحَاجُّونَنَا فِي اللَّهِ ...... وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ | یعنی اگر اس کلمہ جامعہ کو نہیں مانتے جو

تمام نبیوں اور رسولوں اور اللہ کی اتاری ہوئی تمام ہدایتوں پر ایمان اور اللہ ہی کی بندگی و اطاعت کے اقرار پر مشتمل ہے۔ بلکہ اس بات پر اتر گئے ہیں کہ خدا کے بعض نبیوں کو نیکے بعض کو نہیں مانیں گے، اس کی بعض ہدایتوں کو قبول کریں گے، بعض کو نہیں قبول کریں گے۔ درآنحالیکہ یہ تمام انبیاء و رسل خدا ہی کے بھیجے ہوئے اور یہ ساری ہدایتیں اسی کی نازل کی ہوئی ہیں تو اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ وہ خود خدا کے بارے میں تم سے جھگڑ رہے ہیں، گویا ان کا خدا کوئی اور ہے اور تمہارا خدا کوئی اور، حالانکہ تمہارا اور ان کا رب ایک ہی ہے۔ اگر انہوں نے فی الواقع بات اس حد تک بڑھادی ہے کہ اپنا خدا بھی الگ بنا لیا ہے تو اب ان سے کسی خیر کی امید نہ رکھو بلکہ اب یہ بحث، گفتگو بالکل ختم کر کے صاف صاف کہہ دو کہ ہمارے اعمال ہمارے ساتھ ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے ساتھ۔ یعنی اب ہم تمہارے ساتھ کوئی بحث و مناظرہ کرنا بالکل لاحاصل سمجھتے ہیں۔ جب تم خدا کے بارے میں بھی یک سُو نہیں ہو تو ہم تم سے کوئی بحث کرنے کے بجائے صرف یہ واضح کرنا کافی سمجھتے ہیں کہ ہم تو خالص اپنے رب ہی کے لئے ہیں۔

اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰھٖمَ ...... عَمَّا تَعْمَلُوْنَ | یہ یہود و نصاریٰ سے حضرت ابراہیمؑ اور ان کی ذریت کے باب میں ان کے دعوے کو پھر دہرانے کا مطالبہ بطور اتمام حجت کے کیا ہے۔ یعنی کیا فی الواقع تم یہ سنگین بات کہتے ہو کہ ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ اور ان کے اخلاف یہودی یا نصرانی تھے؟ پھر سرزنش کے انداز میں سوال کرایا ہے کہ ان لوگوں کے مذہب وعقیدہ کا حال تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ پھر بانداز حسرت و افسوس فرمایا کہ ان لوگوں سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ کی کسی شہادت کو چھپائیں، یعنی تورات موجود ہے، اس میں ان لوگوں کے مذہب وعقیدہ کی تفصیلات موجود ہیں، اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ان کے زمانوں میں یہودیت اور نصرانیت کا کہیں نام و نشان بھی پایا نہیں جاتا تھا۔ یہ نام تو تم نے ان کے صدیوں بعد گھڑے ہیں۔ خدا نے ہمیشہ اپنے نبیوں اور رسولوں پر وہی دین اتارا ہے جس کا نام اسلام ہے۔ اس کے بعد نہایت سخت دھمکی کے انداز میں فرمایا کہ یہ اللہ کے دین کے خلاف جو شرارتیں تم کر رہے ہو، خدا ان سے بے خبر نہیں ہے، اس کا انجام

تمہارے سامنے آئے گا۔

تِلْکَ اُمَّۃٌ ...... عَمَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ | بعینہٖ یہی آیت اوپر بھی گذر چکی ہے جس سیاق میں یہ اوپر آئی ہے، اسی سیاق میں یہاں بھی آئی ہے۔ وہاں ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔ ملاحظہ ہو تفسیر آیت ۱۳۴۔

۵۲۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی

مذکورہ بالا مجموعۂ آیات کی آیت ۱۲۹ کی وضاحت اگرچہ بقدر ضرورت ہم اوپر کر آئے ہیں لیکن چونکہ اس کا تعلق براہ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی سے ہے جس کے بارے میں منکرین سنت نے اس زمانے میں بعض بہت بے ہودہ سوالات اٹھا دیئے ہیں، اس وجہ سے ہم اس آیت پر یہاں مزید روشنی ڈالیں گے۔

منکرین سنت کا دعوےٰ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلی ذمہ داری بحیثیت پیغمبر کے صرف یہ تھی کہ اللہ تعالےٰ آپ پر جو وحی نازل فرمائے آپ وہ لوگوں تک پہنچا دیں۔ اس کے بعد بحیثیت رسول کے آپ کا فرض ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد نہ تو اللہ تعالےٰ کی طرف سے آپ پر کوئی ذمہ داری ہی ہے اور نہ وحی الٰہی (یا بالفاظ دیگر قرآن) کے سوا آپ کے کسی قول یا فعل کی کوئی مستقل شرعی اہمیت ہی ہے۔ ہمارے نزدیک منکرین سنت کے اس دعوے کی تردید کے لئے قرآن مجید کی یہ آیت ہی کافی ہے۔ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی کی جو تفصیل کی گئی ہے اس میں صرف لوگوں کو قرآن سنا دینے ہی کا ذکر نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ متعدد دوسری چیزوں کا بھی ذکر ہے اور اس آیت سے واضح ہے کہ ان چیزوں کا ذکر بھی آپ کے فرائض نبوت ہی کی حیثیت سے ہوا ہے۔ آیت پر ایک نظر پھر ڈال لیجئے۔ فرمایا ہے۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْھِمْ رَسُوْلًا	اے ہمارے رب، ان میں بھیجو ایک رسول
مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِکَ وَ	انہی میں سے جو ان کو پڑھ کر سنائے تیری آیتیں
یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ	اور ان کو تعلیم دے کتاب اور حکمت کی اور
وَیُزَکِّیْھِمْ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ	ان کا تزکیہ کرے۔ بے شک تو غالب اور

الْحَكِيمُ۔ (۱۲۹ - بقرہ ۵) حکمت والا ہے۔

یہ اس دعا کے الفاظ ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے لئے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل نے فرمائی تھی۔ اسی دعا کے مطابق جب آنحضرتؐ کی بعثت ہوئی تو اللہ تعالٰی نے اہلِ عرب پر اپنے اس احسانِ عظیم کا اظہار یوں فرمایا۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (۲ - جمعہ)

وہی خدا ہے جس نے بھیجا امیوں (بنی اسمٰعیل) میں ایک رسول انہی میں سے جو ان کو پڑھ کر سناتا ہے اس کی آیتیں اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ بیشک یہ لوگ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

ان دونوں آیتوں پر غور کیجئے تو یہ حقیقت واضح ہوگی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جن صفات کے پیغمبر کے لئے دعا کی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعینہٖ انہیں صفات کے ساتھ مبعوث ہوئے اور آپ نے امیوں کے اندر علاوہ سارے کام انجام دیئے بھی جن کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا فرمائی تھی۔

ان دونوں ہی مقامات میں جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرائض کا تعلق ہے ان کے بیان میں کوئی اختلاف نہیں۔ اگر کوئی اختلاف ہے تو صرف یہ کہ اوپر والی آیت میں تزکیہ کا ذکر سب کے آخر میں ہے اور دوسری آیت میں تعلیم کتاب و حکمت سے پہلے لیکن تلاوتِ آیات کے بعد۔ یہ فرق کوئی خاص اہمیت رکھنے والا فرق نہیں۔ تزکیہ کے مقدم و موخر ہونے کی وجہ ایک دوسرے مقام میں ہم واضح کر چکے ہیں[1] کہ تزکیہ تمام دین و شریعت کی غایت اور بعثت انبیاء کا اصل مقصود ہے اور جو چیز کسی کام میں غایت و مقصود کی حیثیت رکھتی ہے وہ عمل میں اگرچہ موخر ہوتی ہے لیکن ارادہ میں مقدم ہوتی ہے اس وجہ سے اصل الکیم میں اس کا ذکر مقدم بھی ہو سکتا ہے اور موخر بھی۔ چنانچہ اسی اعتبار سے تزکیہ کا ذکر ایک آیت میں مقدم ہوا ہے دوسری

[1] اس نکتہ کی وضاحت کے لئے ہماری کتاب "تزکیہ نفس" کی فصل اول ملاحظہ ہو۔

میں موخر۔ اس ترتیب کے فرق کے علاوہ دوسری ساری باتیں دونوں آیتوں میں بالکل مشترک ہیں اور ان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مندرجہ ذیل فرائض بتائے گئے ہیں۔

۱۔ تلاوتِ آیات

۲۔ تعلیم کتاب و حکمت

۳۔ تزکیہ

ان میں سے جہاں تک پہلی چیز — تلاوتِ آیات — کا تعلق ہے، ہم بلا کسی بحث و نزاع کے تسلیم کئے لیتے ہیں کہ اس سے مراد لوگوں کو قرآن مجید سنانا ہی ہے۔ دین و دانش دونوں ہی سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ خدا کے ایک رسول کا اولین فریضہ یہی ہونا چاہیئے کہ وہ اللہ کے بندوں تک اس کی وحی کو پہنچائے۔ لیکن اس تلاوت کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ یہ اس طرح نہیں ہوئی ہے کہ لوگوں کو پوری کتاب بیک دفعہ سنادی گئی ہو بلکہ یہ ۲۳ سال کی وسیع و طویل مدت میں تھوڑی تھوڑی کر کے اتاری گئی اور اسی تدریج کے ساتھ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو سبقاً سبقاً اس کی تعلیم دی۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ کتاب کوئی سہل اور سپاٹ کتاب نہیں ہے بلکہ یہ نہایت گہرے علوم و معارف اور اعلٰی اسرار و حقائق کی کتاب ہے۔ اس وجہ سے اس کے لئے یہ ضروری ہوا کہ یہ سبق سبق کر کے پڑھائی جائے تاکہ لوگوں کی اس کے خزانوں تک رسائی ہو سکے۔ اس حقیقت کو قرآن نے یوں واضح کیا ہے وَقُرْآنًا فَرَقْنَاهُ لِتَقْرَأَهُ عَلَى النَّاسِ عَلَىٰ مُكْثٍ (۱۰۶ - اسرا) اور ہم نے اس قرآن کو تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا تاکہ لوگوں کو اس کو وقفہ وقفہ کے ساتھ سنائے۔

قرآن حکیم کی مذکورہ بالا خصوصیت اس بات کی مقتضی ہوئی کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اس کو ایک قاری کی طرح صرف سنا دینے ہی پر اکتفا نہ فرمائیں بلکہ ایک معلم کی طرح پوری دلسوزی اور پوری شفقت کے ساتھ لوگوں کو اس کی تعلیم بھی دیں۔ چنانچہ اسی بنا پر تلاوت کے ساتھ ساتھ آپ کا دوسرا فرض تعلیم کتاب بتایا گیا۔ یہ تعلیم کتاب کا فریضہ آپ کے فرائض نبوت ہی کا ایک جز اور آپ کا معلم ہونا آپؐ کے منصب رسالت ہی کا ایک پہلو ہے۔ اس وجہ سے اپنی اس حیثیت میں آپ نے جو کچھ لوگوں کو سکھایا اور بتایا اس کو آپ کے فرائض نبوت سے نہ تو خارج کیا جا

سکتا اور نہ اسی کا درجہ اصل کتاب کے مقابل میں گرایا ہی جا سکتا۔

اب غور فرمائیے کہ اس تعلیم کے تقاضے کیا کیا ہو سکتے ہیں؟

اس کا ایک بالکل ابتدائی تقاضا تو یہ ہے کہ قرآن میں جو شرعی اصطلاحات مثلاً صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج، صیام، طواف، عمرہ، نکاح، طلاق وغیرہ استعمال ہوئی ہیں لیکن ان کی عملی شکلیں واضح نہیں کی گئی ہیں ان کو آپ اچھی طرح لوگوں پر واضح کر دیں تاکہ لوگ عملی زندگی میں ان کو اختیار کر سکیں اور ان کے مختلف اجزا کا دین میں جو مقام ہے اس کو متعین کر سکیں۔

دوسری چیز یہ ہے کہ قرآن میں فکر و عمل کی تصحیح کے جو اصول دیئے گئے ہیں ان کے لوازم و تضمنات کے ضروری گوشے واضح کر دیئے جائیں تاکہ ان ابواب میں مزید رہنمائی حاصل کرنے کے لئے وہ روشنی کے میناروں کا کام دیں۔

اسی طرح ایک چیز یہ بھی ہے کہ قرآن میں جو احکام شریعت دیئے گئے ہیں ان کی حیثیت صرف اصولی احکام کی ہے۔ ان میں سے ہر باب کے تحت بے شمار صورتیں ایسی آتی ہیں جن میں احکام کا تعین معلم کی رہنمائی اور اجتہاد پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس اجتہاد کے لئے امت کو بہترین رہنمائی ان مثالوں ہی سے مل سکتی تھی جو اس کتاب کے معصوم معلم نے اپنے اجتہاد سے قائم کیں۔

ایک چوتھی چیز یہ ہے کہ قرآن اجتماعی زندگی کا ایک نظام بھی پیش کرتا ہے لیکن اس کے صرف چاروں گوشے متعین کر دینے والے اصول دے کر اس کی جزئیات و تفصیلات اور اس کے عملی ڈھانچہ کے معاملہ کو معلم کی ذمہ داری پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس چیز کو بھی لوگوں نے حضورؐ ہی کی تعلیم سے سیکھا۔

ان کے علاوہ ایک اہم چیز یہ بھی ہے کہ زیر بحث آیت میں صرف تعلیم کتاب ہی کا ذکر نہیں ہے بلکہ تعلیم حکمت کا بھی ذکر ہے۔ تعلیم حکمت تعلیم شریعت سے بہت وسیع چیز ہے۔ اس سے مراد، جیسا کہ اس لفظ کی وضاحت کرتے ہوئے ہم بیان کر چکے ہیں، وہ دانش و بینش اور وہ بصیرت و معرفت ہے جو زندگی کے ان بعید گوشوں میں بھی انسان کی رہنمائی کرتی ہے جہاں رہنمائی کرنے والی اس کے سامنے کوئی اور روشنی نہیں ہوتی۔

اب غور کیجئے کہ یہ ساری باتیں تعلیم کے تقاضوں میں سے ہیں یا نہیں؟ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان ساری چیزوں کی تعلیم کے لئے بحیثیت ایک خدائی معلم کے مامور تھے یا نہیں؟ اگر ان سوالوں کا جواب اثبات میں ہے اور ظاہر ہے کہ ان کا جواب اثبات ہی کی صورت میں ہو سکتا ہے تو غور کیجئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اس حیثیت میں جو کچھ کہا اور کیا ہے اس کو آپ کے فرائض نبوت کے دائرے سے الگ کس طرح کیا جا سکتا ہے اور اس کی اہمیت کو گھٹایا کس طرح جا سکتا ہے؟ اور پھر اس بات پر غور کیجئے کہ احادیث میں ان چیزوں کے سوا اور کیا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بحیثیت معلم کتاب و حکمت ہونے کے بتائی ہیں یا ان پر عمل کر کے دکھایا ہے؟

اسی طرح اب تزکیہ پر غور کیجئے۔ تزکیہ کا عمل ظاہر ہے کہ تعلیم سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور وسیع الاطراف ہے۔ اوپر ہم واضح کر آئے ہیں کہ اس لفظ میں پاک صاف کرنے اور نشوونما دینے دونوں کا مفہوم شامل ہے۔ یہ بیک وقت علمی بھی ہے اور عملی بھی، ظاہری بھی ہے باطنی بھی، مادی اور جسمانی بھی ہے اور عقلی و روحانی بھی، نیز یہ انفرادی بھی ہے اور سماجی و اجتماعی بھی مختصراً چند بنیادی تقاضے اس کے بھی سامنے رکھ لیجئے۔

اس کا ایک ضروری تقاضا تو یہ ہے کہ لوگوں کے اذہان، اعمال اور اخلاق پر خردبینی نگاہ ڈال کر ان جراثیم سے ان کو پاک کیا جائے جو روحانی اور اخلاقی بیماریوں کے سبب بنتے ہیں اور ساتھ ہی ان کے اندر ان نیکیوں کی تخم ریزی کی جائے جو انسان کے ظاہر و باطن کو سنوارتی اور اس کے عادات و خصائل کو مہذب بناتی ہیں۔

اس کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کی اس طرح تربیت کی جائے کہ ہر خوبی ان کے اندر جڑ پکڑ جائے اور ہر برائی کے خلاف طبیعتوں میں نفرت بیٹھ جائے۔

اس کا تیسرا تقاضا یہ ہے کہ اس تعلیم و تربیت سے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا جائے جو تزکیہ نفوس کے لئے ایک وسیع تربیت گاہ کا کام دینے لگ جائے، جو شخص بھی اس میں سانس لے اسی ماحول کے اثرات لیتے ہوئے اٹھے اور جو شخص بھی اس کے اندر داخل ہو جائے اس پر اسی کا رنگ چڑھ جائے۔

اس ساری تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ یہ خیال بڑا مغالطہ انگیز ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فریضۂ منصبی بحیثیت رسول کے صرف یہ تھا کہ آپ لوگوں کو قرآن پہنچا دیں۔ قرآن کا پہنچا دینا آپ کے فرائض منصبی کا صرف ایک جزو تھا۔ اس کے علاوہ آپ کی یہ ذمہ داری بھی تھی کہ آپ ایک معلم کی طرح لوگوں کو اس قرآن کی تعلیم دیں، اس کے مضمرات و تضمنات، اس کے اجمالات و اشارات اور اس کے اسرار و حقائق لوگوں پر واضح کریں، اس کے عجائب حکمت کے خزانوں تک لوگوں کی رہبری فرمائیں۔ اسی طرح آپ کی یہ ذمہ داری بھی تھی کہ آپ قرآنی حکمت کی روشنی میں افراد اور معاشرہ کی تربیت کے اصول و فروع بھی متعین فرمائیں اور ان اصولوں کے مطابق لوگوں کا تزکیہ بھی کریں۔

یہ سارے کام آپ کے فرائض نبوت میں شامل تھے۔ اس وجہ سے ان مقاصد کے تحت آپ نے جو کچھ بتایا یا جو کچھ کیا اس سب کو امت نے اسی طرح واجب التعمیل سمجھا جس طرح قرآن کو سمجھا اور اسی اہمیت کے ساتھ اس کی حفاظت اور اس کے نقل و روایت کا اہتمام کیا۔ اس کے کسی جزو کے متعلق یہ سوال تو اٹھایا جا سکتا ہے کہ اس کا انتساب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پوری صحت کے ساتھ ثابت ہے یا نہیں لیکن اس کو دین و شریعت سمجھنے سے انکار کرنا خود قرآن مجید کے انکار کے ہم معنی ہے۔

۵۲۔ آگے کا سلسلۂ کلام (آیات ۱۴۲-۱۶۲)

منصب امامت سے یہود کی معزولی کے اسباب و وجوہ کی تفصیل اس مجموعہ آیات پر ختم ہو رہی ہے، اب گویا ان کو معزول کر کے ایک نئی امت کے قیام کا اعلان کیا جا رہا ہے۔ یہ امت، امت وسط ہے یعنی یہ اس صراطِ مستقیم پر قائم ہے جو دین حق کی اصل خدائی شاہراہ ہے، اس کی ملت، ملتِ ابراہیمؑ اور اس کا قبلہ، قبلۂ ابراہیمی بیت اللہ الحرام ہے، اس کا فریضۂ منصبی یہ ہے کہ جس طرح پیغمبر نے اس کے سامنے اللہ کے اصل دین کی گواہی دی ہے اسی طرح یہ خلق خدا کے سامنے اللہ کے دین کی شہادت دینے والی ہوگی۔

ان آیات کے زمانۂ نزول تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان نمازوں میں بیت المقدس کی طرف رخ کرتے تھے۔ اب ملتِ ابراہیمی کے تعلق سے ضروری ہوا کہ اس

امت کا قبلہ مسجد حرام ہو۔ اس وجہ سے تحویل قبلہ کا حکم ہوا۔ پھر اس ردِّ عمل کی تفصیلات بیان ہوئیں جو اس واقعہ کا یہود اور مسلمانوں کے بعض گروہوں پر ہوا اور ساتھ ہی تحویل قبلہ کی حکمتیں اور قبلہ سے متعلق وہ ضروری ہدایات بیان ہوئیں جو مسلمانوں کو قبلہ کے باب میں جادۂ مستقیم پر استوار رکھنے کے لئے ضروری تھیں اور جن کا اہتمام نہ رکھنے کی وجہ سے یہود اور نصاریٰ اصل قبلہ سے منحرف ہو گئے۔

پھر ایک مستقل امت کی حیثیت سے مسلمانوں سے یہ عہد لیا گیا کہ تحویلِ قبلہ کے بعد اب تم یہود و نصاریٰ سے الگ ایک مستقل امت کی حیثیت سے ممتاز ہو گئے، جس طرح تمہارا رسول ایک الگ رسول ہے جو ان تمام صفات کا مظہر ہے جن کے لئے ابراہیمؑ نے دعا کی تھی اسی طرح تمہارا قبلہ ابراہیمی قبلہ ہے، اب تم ان یہود سے ذرا بھی نہ ڈرو، صرف اللہ ہی سے ڈرو تاکہ تمہیں اللہ کے دین کامل کی نعمت نصیب ہو اور تمہارے لئے شریعتِ الٰہی کی راہیں کھلیں۔ تم مجھے یاد رکھو گے تو میں تمہیں یاد رکھوں گا، میری شکرگزاری کرتے رہنا، ناشکری نہ کرنا۔

اس کے بعد ان متوقع خطرات کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو ایک مستقل امت کی حیثیت سے نمایاں ہونے کے بعد مخالفین و معاندین کی طرف سے پیش آ سکتے ہیں اور ان خطرات کے مقابلہ کے لئے مسلمانوں کو جن تیاریوں اور جن ایمانی و اخلاقی اسلحہ سے مسلح ہونے کی ضرورت ہے، ان کی طرف رہنمائی فرمائی ہے۔

آخر میں خانہ کعبہ کے تعلق سے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ خانہ کعبہ کی طرح صفا اور مروہ بھی اللہ کے شعائر میں داخل ہیں اس لئے کہ یہی مروہ ہے جو اصل قربان گاہ ہے۔ لیکن یہود نے تحریف کے ذریعہ سے ان نشاناتِ راہ پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی تاکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعلق اس گھر سے بالکل کاٹ دیں۔ یہود اپنی اس شرارت کے سبب سے اس بات کے مستحق ہیں کہ ان پر اللہ کی اور تمام لعنت کرنے والوں کی لعنت ہو۔

اس تمہید کے بعد اب آیات تلاوت فرمایئے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

سَیَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ كَانُوْا
عَلَیْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ؕ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ
مُّسْتَقِیْمٍ ۝۱۴۲ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَی
النَّاسِ وَ یَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْكُمْ شَهِیْدًا ؕ وَ مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ
الَّتِیْ كُنْتَ عَلَیْهَاۤ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ یَّنْقَلِبُ عَلٰی
عَقِبَیْهِ ؕ وَ اِنْ كَانَتْ لَكَبِیْرَةً اِلَّا عَلَی الَّذِیْنَ هَدَی اللّٰهُ ؕ وَ مَا
كَانَ اللّٰهُ لِیُضِیْعَ اِیْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ۝۱۴۳
قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّیَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪
فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ حَیْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ
شَطْرَهٗ ؕ وَ اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ
رَّبِّهِمْ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعْمَلُوْنَ ۝۱۴۴ وَ لَىِٕنْ اَتَیْتَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا
الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰیَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَ مَاۤ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ
وَ مَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَ لَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ
مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝۱۴۵ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ
الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَ اِنَّ فَرِیْقًا مِّنْهُمْ
لَیَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ ۝۱۴۶ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ
الْمُمْتَرِیْنَ ۝۱۴۷ وَ لِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّیْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرٰتِ ؕ اَیْنَ
مَا تَكُوْنُوْا یَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِیْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝۱۴۸
وَ مِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ اِنَّهٗ لَلْحَقُّ
مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝۱۴۹ وَ مِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ
فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ حَیْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ
شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَیْكُمْ حُجَّةٌ ۗ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا
مِنْهُمْ ۗ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَ اخْشَوْنِیْ ۗ وَ لِاُتِمَّ نِعْمَتِیْ عَلَیْكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ

تَهْتَدُوْنَ ۝۱۵۰ كَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِیْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ یَتْلُوْا عَلَیْكُمْ اٰیٰتِنَا
وَ یُزَكِّیْكُمْ وَ یُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ یُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا
تَعْلَمُوْنَ ۝۱۵۱ فَاذْكُرُوْنِیْۤ اَذْكُرْكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِیْ وَ لَا تَكْفُرُوْنِ ۝۱۵۲
یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ
الصّٰبِرِیْنَ ۝۱۵۳ وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ
اَحْیَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝۱۵۴ وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ
الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ ؕ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ۝۱۵۵
الَّذِیْنَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ ۙ قَالُوْۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیْهِ
رٰجِعُوْنَ ۝۱۵۶ اُولٰٓىِٕكَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ ۫ وَ اُولٰٓىِٕكَ
هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝۱۵۷ اِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ
الْبَیْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِ اَنْ یَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَ مَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا ۙ
فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِیْمٌ ۝۱۵۸ اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلْنَا مِنَ
الْبَیِّنٰتِ وَ الْهُدٰی مِنْۢ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِی الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓىِٕكَ
یَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ۝۱۵۹ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا
وَ بَیَّنُوْا فَاُولٰٓىِٕكَ اَتُوْبُ عَلَیْهِمْ ۚ وَ اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ۝۱۶۰
اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓىِٕكَ عَلَیْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ
وَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ۝۱۶۱ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ۚ لَا یُخَفَّفُ
عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَ لَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ ۝۱۶۲

اب جو بے وقوف لوگ ہیں وہ کہیں گے کہ ان لوگوں کو اس قبلہ سے جس پر
یہ پہلے تھے کس چیز نے روگردان کر دیا - کہہ دو مشرق اور مغرب اللہ ہی کے ہیں
وہ جس کو چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے - اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک
بیچ کی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دینے والا

بنے۔ اور جس قبلہ پر تم تھے ہم نے اس کو صرف اس لئے ٹھہرایا تھا کہ ہم الگ کر دیں ان لوگوں کو جو رسول کی پیروی کرنے والے ہیں ۔ ان لوگوں سے جو پیٹھ پیچھے پھر جانے والے ہیں ۔ بے شک یہ بات جاری ہے مگر ان لوگوں پر جن کو اللہ ہدایت نصیب کرے ۔ اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ وہ تمہارے ایمان کو ضائع کرنا چاہے اللہ تو لوگوں کے ساتھ بڑا مہربان ہے۔

ہم آسمان کی طرف تمہارے رخ کی گردش دیکھتے رہے ہیں، سو ہم نے فیصلہ کر لیا کہ ہم تمہیں اس قبلہ کی طرف پھیر دیں جس کو تم پسند کرتے ہو ۔ تو تم اپنا رخ مسجد حرام کی طرف کرو ۔ اور جہاں کہیں بھی تم ہو تو اپنے رخ اسی کی طرف کرو ۔ جن لوگوں کو کتاب ملی وہ جانتے ہیں کہ یہی ان کے رب کی جانب سے حق ہے ۔ اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے ۔ اور اگر تم اہل کتاب کے سامنے ہر قسم کی نشانیاں بھی پیش کر دو تو بھی یہ تمہارے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے اور نہ تم ان کے قبلہ کی پیروی کرنے والے بن سکتے اور نہ وہ ایک دوسرے کے قبلہ کی پیروی کرنے والے بن سکتے ۔ اور اگر تم اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آ چکا ہے ان کی خواہشوں کی پیروی کرو گے تو بلا شبہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے ۔ جن کو ہم نے کتاب عنایت کی ہے وہ اس کو پہچانتے ہیں جیسا کہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں ۔ البتہ ان میں ایک گروہ ہے جو جانتے بوجھتے حق کو چھپاتا ہے۔ یہی حق ہے تمہارے رب کی جانب سے تو تم شک کرنے والوں میں سے نہ بن جانا۔

ہر ایک کے لئے ایک سمت ہے وہ اسی کی طرف رخ کرنے والا ہے تو تم نیکیوں کی راہ میں سبقت کرو ۔ جہاں کہیں بھی تم ہو گے ، اللہ تم سب کو جمع کرے گا ۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اور جہاں کہیں سے بھی تم نکلو تو اپنا رخ مسجد حرام ہی کی طرف کرو ۔ بے شک یہی حق ہے تمہارے رب کی جانب سے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے بے خبر

نہیں ہے۔

اور جہاں کہیں سے بھی نکلو تو اپنا رخ مسجد حرام ہی کی طرف کرو ۔ اور جہاں کہیں بھی تم ہو تو اپنے رخ اسی کی جانب کرو تاکہ لوگوں کے لئے تمہارے خلاف کوئی حجت باقی نہ رہے ۔ مگر جو ان میں سے ظالم ہیں تو ان سے نہ ڈرو ، مجھی سے ڈرو ۔ اور تاکہ میں اپنی نعمت تم پر تمام کروں اور تاکہ تم راہ یاب ہو ۔ چنانچہ ہم نے تم میں ایک رسول بھیجا تم ہی میں سے جو تمہیں ہماری آیتیں پڑھ کر سناتا اور تمہیں پاک کرتا ہے اور تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں ان چیزوں کی تعلیم دیتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے ۔ تو تم مجھے یاد رکھو ۔ میں تمہیں یاد رکھوں گا میری شکر گزاری کرتے رہنا ، میری ناشکری نہ کرنا۔

اے ایمان والو ، ثابت قدمی اور نماز سے مدد چاہو ۔ بے شک اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہے اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوتے ہیں ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم محسوس نہیں کرتے ۔ بیشک ہم تمہارا امتحان کریں گے کسی قدر خوف ، بھوک اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے اور ان ثابت قدموں کو خوش خبری سنا دو ۔ جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ بے شک ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں ۔ یہی لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی عنایتیں ہیں اور رحمت اور یہی لوگ راہ یاب ہونے والے ہیں۔

بے شک صفا اور مروہ اللہ کے شعائر میں سے ہیں تو جو بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی حرج نہیں کہ ان کا طواف کرے اور جس نے کوئی نیکی خوش دلی کے ساتھ کی تو اللہ قبول کرنے والا اور جاننے والا ہے ۔ بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں ہماری اتاری ہوئی کھلی کھلی نشانیوں اور ہماری ہدایت کو ، بعد اس کے کہ ہم نے وہ کتاب میں کھول کر لوگوں کے لئے بیان کر دی تھیں تو وہی لوگ ہیں جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور جن پر لعنت کرنے والے لعنت کریں گے ،

البتہ جن لوگوں نے توبہ کر لی اور اصلاح کر لی اور واضح طور پر بیان کر دیا تو ان کی توبہ میں قبول کروں گا۔ میں بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور اسی کفر کی حالت میں مر گئے ان پر اللہ کی، فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔ نہ ان کا عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو مہلت ہی ملے گی۔

۵۴ - الفاظ اور جملوں کی وضاحت

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ ...... اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ | سفہاء سفیہ کی جمع ہے جس کے معنی نادان اور بے وقوف کے ہیں۔ یہاں اشارہ اس سے یہود کی طرف ہے۔ یہود کے بے وقوف قرار دینے کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم آیت وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرَاهِيمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ۔ ۱۳۰ - بقرہ (اور ابراہیمؑ کی ملت سے اس کے سوا کون بے رغبت ہو سکتا ہے جو اپنے آپ کو حماقت میں مبتلا کرے) میں اشارہ کر چکے ہیں۔ یہود ایک طرف تو ملتِ ابراہیمؑ کے پیرو ہونے کے مدعی تھے دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی تعلیم و دعوت کے سخت دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے حالانکہ آپ اصل ملتِ ابراہیمی کے داعی بن کر تشریف لائے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی الٹی حرکت نادان اور بے وقوف لوگ ہی کر سکتے تھے۔ اس وجہ سے قرآن نے ان کے لئے سفہاء کا لفظ استعمال کیا۔

یہ تمہید ہے تحویلِ قبلہ کے اس حکم کی جس کا ذکر آگے دو آیتوں کے بعد آ رہا ہے۔ اس تمہید میں اشارہ ہے اس ردِ عمل کی طرف جو اس حکم کا یہود اور منافقین پر ہوگا۔ اصل حکم سے پہلے اس ردِ عمل کے بیان کرنے کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ قبلہ کی تبدیلی کا حکم کوئی معمولی حکم نہیں تھا، اسلام کے مخالفوں اور اس کے حامیوں دونوں ہی کے اندر یہ خاصی ہلچل پیدا کر دینے والا حکم تھا۔ اس وجہ سے ضروری ہوا کہ اس حکم سے پہلے اس کے متوقع ردِ عمل کے لئے ذہنوں کو تیار کر دیا جائے۔ دوسری وجہ اس کی یہ ہے کہ اس سے اوپر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی ذریت کی جو سرگزشت بیان ہوئی ہے اس سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو کر ہر قاری کے

سامنے آ چکی تھی کہ حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسمٰعیلؑ، حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ اور ان کی اولاد کا مذہب اسلام تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ میں عبادتِ الٰہی کے لئے جو مرکز تعمیر کیا تھا وہ ان کی ساری ہی ذریت کا مرکز اور قبلہ تھا۔ یہاں تک کہ بیت المقدس بھی جب تعمیر ہوا تو اس کی تعمیر بھی اس طرح ہوئی کہ بنی اسرائیل کی قربانیوں کا رخ خانہ کعبہ کی طرف ہو۔ یہ تمام باتیں بالکل غیر مبہم طور پر اس بات کو ظاہر کر رہی تھیں کہ آنحضرت صلعم کا بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنا ایک بالکل عارضی معاملہ تھا اور اب وقت آ گیا ہے کہ آپ کو بیت المقدس کے بجائے خانہ کعبہ کی طرف نماز پڑھنے کا حکم دے دیا جائے۔ اس وجہ سے یہ تمہید ایک ایسے واقعہ کی تمہید تھی جس کے واقع ہونے کا انتظار یہود و نصاریٰ کو بھی تھا اور مسلمانوں کو بھی۔

مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا (ان کو ان کے اس قبلہ سے کس چیز نے ہٹا دیا جس پر وہ اب تک تھے) یہ تحویلِ قبلہ کے حکم پر اہلِ کتاب کے ردِ عمل کا بیان ہے کہ اب تک یہ لوگ مسلمانوں پر جو اعتراضات کرتے رہے ہیں ان کا بیان اوپر ہو چکا ہے۔ اب جب قبلہ بیت المقدس کی بجائے خانہ کعبہ کو قرار دیا جائے گا تو یہ اس پر بھی ہنگامہ اٹھائیں گے کہ مسلمانوں نے تمام انبیاء کے قبلہ — بیت المقدس — کو چھوڑ کر جس کی طرف رخ کر کے وہ اب تک نماز پڑھتے رہے تھے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد یہ الگ کیوں بنا لی؟

قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۔ (کہہ دو، مشرق اور مغرب دونوں اللہ ہی کے ہیں، وہ جس کو چاہتا ہے سیدھا رستہ دکھا دیتا ہے) یہ یہود و نصاریٰ کے مذکورہ بالا اعتراض کا جواب ہے کہ تمہیں اب قبلہ سے کیا واسطہ؟ تم تو اصل قبلہ کے بجائے مشرق و مغرب کے چکر میں پھنس گئے ہو، نصاریٰ مشرق کو اپنا قبلہ قرار دیے بیٹھے ہیں اور یہود مغرب کو، حالانکہ سمتوں میں سے کسی سمت کو بھی اللہ تعالےٰ کے ساتھ کسی خصوصیت کی کوئی وجہ نہیں، اللہ تعالےٰ تو ہر سمت میں ہے، مشرق و مغرب، شمال و جنوب سب اسی کی فرمانروائی میں ہیں۔ اس کے ساتھ اگر خصوصیت ہو سکتی ہے تو کسی ایسے گھر کو ہو سکتی ہے جس کو وہ مخصوص فرمائے اور قبلہ قرار دے۔ یہ خصوصیت رکھنے والا گھر ابراہیمؑ

اور اسمٰعیلؑ کا تعمیر کردہ گھر مکہ کا بیت اللہ ہے، وہی تمام اولادِ ابراہیمؑ کا قبلہ قرار پایا تھا اور اسی کو قبلہ قرار دے کر بیت المقدس کی بھی تعمیر ہوئی تھی، اس حقیقت کے نشانات و آثار تورات میں موجود تھے لیکن تم نے تعصب کی وجہ سے یہ نشانات مٹا دیئے تھے، لیکن تمہاری ان مخالفانہ کوششوں کے علی الرغم اللہ تعالےٰ نے اپنے آخری نبی کے ذریعے سے جن کو چاہا سیدھا راستہ دکھا دیا اور اب وہ تمہارے پیدا کردہ پیچ و خم سے نکل کر ایک صراطِ مستقیم پر چل کھڑے ہوئے ہیں۔[1]

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا .... وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا

کذٰلک کا اشارہ اوپر والے معاملہ کی طرف ہے۔ یعنی جس طرح ہم نے قبلہ کے معاملہ میں یہود و نصاریٰ کے پیدا کردہ پیچ و خم اور مشرق و مغرب کے چکر سے تمہیں نکال کر صراطِ مستقیم کی طرف تمہاری رہنمائی کی اسی طرح ہم نے تم کو یہودیت اور نصرانیت کی پگڈنڈیوں سے بچا کر دین کی بیچ شاہراہ پر قائم رہنے والی امت، بنایا تاکہ رسول تم پر اللہ کے دین کی گواہی دیں اور تم خلقِ خدا پر اللہ کے دین کی گواہی دو۔

وَسَط لفظ ولد کی طرح مذکر اور مؤنث، واحد اور جمع سب کے لئے آتا ہے۔ اس کے معنی ہیں وہ شے جو دو طرفوں کے درمیان بالکل وسط میں ہو۔ یہیں سے اس کے اندر بہتر ہونے کا مفہوم پیدا ہوگیا اس لئے کہ جو شے دو کناروں کے درمیان ہوگی وہ نقطۂ توسط و اعتدال پر ہوگی اور یہ اس کے بہتر ہونے کی ایک فطری دلیل ہے۔ امتِ مسلمہ کو امتِ وسط کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ امت ٹھیک ٹھیک دین کی اس بیچ شاہراہ پر قائم ہے جو اللہ تعالیٰ نے خلق کی رہنمائی کے لئے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے کھولی ہے اور جو ابتدا سے ہدایت کی اصل شاہراہ ہے۔ یہود و نصاریٰ اللہ کے نبیوں میں تفریق کر کے اس شاہراہ سے ہٹ گئے اور انہوں نے یہودیت و نصرانیت کی پگ ڈنڈیاں نکال لیں، اسی طرح وہ اصل قبلہ سے منحرف ہو کر مشرق و مغرب کے جھگڑوں میں پڑ گئے۔ لیکن یہ امت ان کج پیچ

[1] یہاں ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے اس کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے آیات ۱۱۵- اور ۱۲۵ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجئے۔

کی راہوں میں بھٹکنے کے بجائے دین کی اصل راہ پر قائم ہے۔ اس کا کلمہ تفریق کے بجائے وحدت کا کلمہ ہے جس کا حوالہ اوپر ان الفاظ میں گزر چکا ہے۔

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ

(۱۳۶ - بقرہ)

تم کہہ دو کہ ہم تو اللہ پر ایمان لائے اور اس چیز پر جو ہم پر اتاری گئی اور اس چیز پر جو ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب اور ان کی اولاد پر اتاری گئی اور اس چیز پر ایمان لائے جو موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی جانب سے ملی۔ ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔

اسی طرح اس امت نے قبلہ کے معاملہ میں مشرق و مغرب کے جھگڑے میں پڑنے کے بجائے اس قبلہ ابراہیمی کی پیروی کی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد مبارک سے برابر تمام نبیوں اور رسولوں کا قبلہ رہا۔ چنانچہ بیت المقدس کی تعمیر بھی، جیسا کہ اوپر بیان ہوا اسی کو قبلہ قرار دے کر ہوئی۔ لیکن یہود نے بربنائے تعصب اس حقیقت کو چھپانے کی کوشش کی۔

دین کے معاملہ میں امتِ مسلمہ کی یہی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے قرآن میں دوسری جگہ اس امت کو خیر امت (بہترین امت) کہا گیا ہے اوپر گزر چکا ہے کہ جو چیز ٹھیک نقطۂ اعتدال و توسط پر ہوگی وہ لازماً بہترین بھی ہوگی۔ یہ امت چونکہ امتِ وسط ہے اس وجہ سے یہ خیر امت بھی ہے۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہود کا دین بہت سخت اور نصاریٰ کا دین بہت نرم ہے، اسلام ان دونوں کے درمیان ایک معتدل دین ہے اس وجہ سے اس دین معتدل کی حامل امت کو امتِ وسط قرار دیا گیا۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے جہاں تک اصل دین کا تعلق ہے یہود و نصاریٰ دونوں کا دین ایک ہی ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام

نے اپنی امت پر تورات کی پابندی اسی طرح واجب قرار دی تھی جس طرح اس کی پابندی یہود پر واجب تھی۔ اگر انہوں نے اس سے الگ کوئی تعلیم دی ہے تو اس کی نوعیت تورات سے جدا کسی مستقل تعلیم کی نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت صرف حکمتِ دین اور روحِ دین کی ہے۔ یہود اپنی دنیا پرستی کی وجہ سے دین کی اصل حقیقتوں سے ہٹ کر صرف رسوم و قیود کے غلام اور الفاظ و کلمات کے پرستار بن کے رہ گئے تھے، حضرت مسیح علیہ السلام نے ان کو حکمتِ دین سے آشنا کیا۔ انجیل تورات سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ تورات ہی کے رموز و حقائق کی طرف ایک حکیمانہ توجہ دلاتی ہے۔

لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (تاکہ تم لوگوں پر اللہ کے دین کے گواہ بنو اور رسول تمہارے اوپر اللہ کے دین کا گواہ بنے) یہ امت وسط کے فریضۂ منصبی اور اس کے قیام کی ضرورت کا بیان ہے۔ اوپر کی تفصیلات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ اللہ تعالےٰ نے جن لوگوں کو رہنمائی کے منصب پر مامور کیا تھا انہوں نے خدا کے میثاق کو توڑ دیا تھا اس کی شریعت میں تبدیلیاں کر دیں، اس کی صراطِ مستقیم گم کر دی، اس کے مقرر کئے ہوئے قبلہ سے منحرف ہو گئے اور جن شہادتوں کے وہ امین بنائے گئے تھے ان کو انہوں نے چھپایا۔ ایسے حالات میں عالمِ انسانیت کی سب سے بڑی ضرورت اگر کوئی ہو سکتی تھی تو یہی ہو سکتی تھی کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسی امت برپا کرے جو خدا کی سیدھی راہ پر قائم ہو، جو اللہ کے رسول کے ذریعہ سے اصل دین کی حامل بنے اور پھر رہتی دنیا تک لوگوں کے سامنے اس دین کی گواہی دے۔

"رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو"، سے یہ بات واضح طور پر نکلتی ہے کہ شہادت علی الناس کا جو فرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بحیثیت رسول کے تھا آپ کے بعد آپ کی امت کی طرف منتقل ہوا اور اب یہ اس امت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر دور، ہر ملک اور ہر زبان میں لوگوں پر اللہ کے دین کی گواہی دے۔ اگر وہ اس فرض میں کوتاہی کرے گی تو اس دنیا کی گمراہیوں کے نتائج بھگتنے میں دوسروں کے ساتھ وہ بھی برابر کی شریک ہوگی۔

ہمارے اربابِ تاویل نے عام طور پر اس شہادت کو آخرت سے متعلق مانا ہے کہ یہ امت

گمراہوں کے خلاف انبیاء کی تائید میں آخرت میں شہادت دے گی کہ ان گمراہوں کو اللہ کا دین پہنچ چکا تھا، اس کے باوجود انہوں نے گمراہی کی یہ روش اختیار کی لیکن ہمارے نزدیک اس تخصیص و تحدید کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس امت کو شہداء اللہ ہونے کا یہ مرتبہ آخرت میں بھی حاصل ہوگا۔ لیکن آخرت میں یہ مرتبہ اسی وجہ سے حاصل ہوگا کہ اللہ تعالےٰ نے اس دنیا میں اس کو اس منصب پر سرفراز فرمایا ہے جو امت اس دنیا میں دینِ حق کی گواہ ہے، ظاہر ہے کہ وہی آخرت میں بھی اس پوزیشن میں ہوگی کہ گواہی دے کہ لوگوں کو اللہ کا دین ٹھیک ٹھیک پہنچایا یا نہیں۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ

جَعَلَ کا لفظ وسیع معنوں میں آتا ہے۔ اس کے ایک معنی جائز ٹھہرانے اور مشروع قرار دینے کے بھی ہیں، مثلاً مَا جَعَلَ اللَّهُ مِنْ بَحِيرَةٍ وَلَا سَائِبَةٍ وَلَا وَصِيلَةٍ (۱۰۳ - مائدہ) (اور خدا نے بحیرہ، سائبہ اور وصیلہ کو مشروع نہیں کیا)

عَلِمَ يَعْلَمُ کے معنی جس طرح جان لینے اور متعین کر لینے کے ہیں، اسی طرح اس کے معنی ممیز کر دینے، چھانٹ کر الگ کر دینے اور ظاہر کر دینے کے بھی ہیں، مثلاً وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتَّىٰ نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِينَ مِنْكُمْ وَالصَّابِرِينَ (۳۱ - محمد) (اور ہم تمہیں جانچیں گے یہاں تک کہ ظاہر کر دیں تمہارے اندر سے ان لوگوں کو جو جہاد کرنے والے اور ثابت قدم رہنے والے ہیں) أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ (۱۴۲ - آل عمران) (کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے تمہارے اندر سے ان لوگوں کو ظاہر نہیں کیا جنہوں نے جہاد کیا)

مطلب یہ ہے کہ یہ جو تمہیں بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کی اجازت دے دی گئی تھی تو اس لئے نہیں کہ یہی تمہارا مستقل قبلہ ہے بلکہ یہ اجازت ایک عارضی اور وقتی اجازت تھی اور مقصود اس اجازت سے یہ تھا کہ پھر اس قبلہ کی تبدیلی تمہارے لئے امتحان کی ایک کسوٹی بنے اور اس کے ذریعہ سے یہ ظاہر کر دیا جائے کہ تمہارے اندر کتنے آدمی ایسے ہیں جو فی الواقع رسول کے پیرو ہیں اور کتنے ایسے ہیں جو رسول سے زیادہ

اپنی پچھلی روایات کے پرستار ہیں اور وہ پھر مڑ کر اپنے قدیم دین ہی کی طرف چلے جاتے ہیں۔

یہ بات یہاں ملحوظ رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب نماز کا حکم ہوا تو آپ نے بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا۔ شروع شروع میں حضورؐ کا طریقہ یہ تھا کہ جن معاملات میں آپ کے سامنے وحی الٰہی کی کوئی واضح رہنمائی نہ ہوتی ان میں آپ پچھلے انبیاء کے طریقہ پر عمل کرتے چنانچہ قبلہ کے معاملہ میں بھی آپ نے یہی کیا۔ جب تک آپ مکہ میں رہے روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نمازوں کے لئے اس طرح کھڑے ہوتے کہ بیت اللہ اور بیت المقدس دونوں سامنے رہتے لیکن جب آپ نے مدینہ کو ہجرت فرمائی تو سمت کے تبدیل ہو جانے کی وجہ سے بیت اللہ کی طرف رخ کرنے کا امکان باقی نہیں رہا۔ قدرتی طور پر خانہ کعبہ سے یہ انقطاع آپ کے قلب مبارک پر شاق گزرا اور آپ کو اس بارے میں وحی الٰہی کا انتظار رہنے لگا۔ لیکن حکمتِ الٰہی اس بات کی مقتضی ہوئی کہ ابھی کچھ عرصہ تک آپ اور بیت المقدس ہی کی طرف نماز پڑھیں، چنانچہ ہجرت کے بعد بھی ۱۶-۱۷ مہینے آپ بیت المقدس ہی کی طرف نمازیں پڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ غزوہ بدر سے کم و بیش دو ماہ پہلے قبلہ کی تبدیلی کا حکم نازل ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے اتنے عرصہ تک بیت المقدس کے قبلہ پر قائم رکھنے اور پھر اس سے ہٹا کر خانہ کعبہ کو قبلہ قرار دینے کی حکمت یہ بیان فرمائی ہے کہ اس طرح اس نے مسلمانوں کو ایک امتحان میں ڈال کر ان کے کھرے اور کھوٹے میں امتیاز کیا ہے تاکہ مدینہ آنے کے بعد جو خام قسم کے عناصر اہل کتاب میں سے مسلمانوں کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں وہ اس امتحان سے گزر کر یا تو اسلام کی طرف یکسو ہو جائیں یا چھٹ کر ان سے الگ ہو جائیں۔

وَإِن كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ یعنی قبلہ کی تبدیلی ہے تو ایک سخت امتحان اس لئے کہ اس طرح کے معاملات میں جن کا تعلق دین سے ہو اور دین کی بھی ایک بنیادی چیز سے، آدمی فطری طور پر جذباتی اور روایت پرست بن جایا کرتا ہے۔ ان میں کوئی معمولی سی تبدیلی بھی اس کو سخت گراں گزرتی ہے، لیکن دین میں اصل چیز جس کا وزن ہے وہ خدا اور رسول کی کامل اطاعت اور اخلاص ہے۔

اس وجہ سے ان تعصبات پر جو اخلاص کے لئے حجاب بنے ہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیاء وقتاً فوقتاً ضرب لگاتے رہے ہیں۔ انبیاء اور ادیان کی تاریخ گواہ ہے کہ ہر نبی کی امپر امتوں کو اس قسم کے امتحانوں سے گزرنا پڑا ہے۔ یہ امتحان اللہ تعالیٰ کی ایک سنت ہے۔ اس سنت کے تقاضے سے ہر نبی کے زمانے میں دین کے رسوم و ظواہر میں بہت سی تبدیلیاں ہوئیں تاکہ اس طرح کھرے اور کھوٹے میں امتیاز ہو سکے۔ جو لوگ اپنے قومی اور گروہی تعصبات کے پھندوں میں گرفتار ہو چکے ہیں ان کا کھوٹ ان امتحانوں سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ وہ خدا اور رسول کی ہدایت اختیار کرنے کے بجائے اپنی روایات پر اڑ جاتے ہیں لیکن جن کے اندر اخلاص کی روح موجود ہوتی ہے وہ اپنے اس اخلاص کے فیض سے اللہ کی ہدایت قبول کرنے کی توفیق پاتے ہیں ——— چنانچہ قبلہ کی اس تبدیلی کا بھی ردِ عمل اسی طرح کا ہوا جو لوگ اپنے پچھلے تعصبات ہی میں پھنسے ہوئے محض کسی وقتی مصلحت کے تحت اسلام کی صفوں میں آ گھسے تھے اس تبدیلی کے بعد وہ پھر پیچھے ہٹ گئے۔ اس کے برعکس جو لوگ محض اللہ کی بندگی اور اس کے رسول کی اطاعت کے جذبہ کے ساتھ اسلام میں آئے تھے ان کے لئے اس تبدیلی نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور رحمت کے نہایت وسیع دروازے کھول دیئے۔

یہ بات کہ اللہ کا معاملہ یوں نہیں ہے کہ وہ تمہارے ایمان کو ضائع کرے، وہ تو لوگوں کے معاملہ میں نہایت مہربان اور رحیم ہے، یہاں ایک نہایت اہم سوال کا جواب ہے جو از خود پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جب قبلہ کی تبدیلی خود قرآن کے اپنے بیان کے مطابق بھی ایک سخت امتحان ہے تو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اس قسم کے سخت امتحان میں کیوں ڈالنا پسند فرمایا۔ جس کا نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ بہت سے لوگ اس امتحان میں ناکام رہ جانے کے سبب سے اپنے ایمان ہی کھو بیٹھیں۔ قرآن نے اس شبہ کا ازالہ اس طرح فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اس طرح کے امتحانوں میں اس لئے نہیں ڈالتا کہ لوگ اپنے ایمان ضائع کر بیٹھیں بلکہ یہ امتحان اللہ تعالیٰ کی رافت و رحمت کے مظہر ہیں۔ انہی امتحانوں سے بندوں کی صلاحیتیں نشو و نما پاتی ہیں۔ انہی کے ذریعہ سے ان کی وہ قوتیں اور صلاحیتیں بروئے کار آتی ہیں جن کے خزانے قدرت نے ان کے اندر ودیعت کئے ہیں۔ انہی کے ذریعے سے ان کے

کھرے اور کھوٹے، ان کے مخلص اور منافق اور ان کے سچے اور جھوٹے میں امتیاز ہوتا ہے۔ یہ امتحان نہ ہو تو اچھے اور برے، خام اور پختہ، گہر اور شیشہ میں کوئی فرق ہی نہ رہ جائے۔ ہر مدعی کو اس کے دعوے میں سچا ماننا پڑے اور ہر کاذب کی باتوں کی تصدیق کرنی پڑے یہاں تک کہ آخرت میں بھی کسی کو انعام یا کسی کو سزا دینے کے لئے کوئی حجت و دلیل باقی نہ رہ جائے۔ مزید غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس کارخانہ کائنات کا سارا حسن و جمال اور اس کی ساری حکمت و برکت اللہ تعالیٰ کی اسی سنتِ ابتلا کے اندر مضمر ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو یہ سارا کارخانہ بالکل بے حکمت اور بے مصلحت بلکہ کھلنڈرے کا ایک کھیل بن کے رہ جائے۔

زبان کا یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ یہاں اللہ تعالےٰ نے اپنے اسماء میں سے رؤف اور رحیم کا حوالہ دیا ہے۔ رؤف رافت سے ہے جس کے اندر دفع شر غالب ہے اور رحیم رحمت سے ہے جس کے اندر اثباتِ خیر کا پہلو نمایاں ہے۔ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہی دونوں پہلو اللہ تعالیٰ کی اس سنت ابتلاء و امتحان میں ملحوظ ہیں جس کی طرف یہ آیت اشارہ کر رہی ہے یعنی بندوں کو خرابیوں اور کمزوریوں سے پاک کر کے فضائل و محاسن سے آراستہ کرنا۔ یہاں ان اشارات پر ہم کفایت کرتے ہیں، آگے مختلف مقامات پر یہ سنت اللہ مختلف پہلوؤں سے زیر بحث آئے گی۔

عام طور پر مفسرین نے اس آیت کو اس سیاق میں لیا ہے کہ تحویل قبلہ کے بعد لوگوں میں یہ سوال پیدا ہوا کہ جو لوگ پہلے ہی قبلہ کے دوران میں وفات پا چکے ان کا کیا بنے گا۔ ان کی نمازیں قبول ہوں گی یا نہیں؟ یہ اس سوال کا جواب دیا گیا ہے لیکن ہمارے نزدیک نہ تو اس سوال کے پیدا ہونے کی کوئی وجہ تھی اور نہ اس کے جواب دینے کی ضرورت تھی۔ اصل حقیقت وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا | یہاں عربی زبان کا ایک خاص اسلوب اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے وہ یہ کہ افعالِ ناقصہ کے صیغے عموماً مضارع سے پہلے حذف کر دیئے جاتے ہیں مثلاً "کان یفعل" میں صرف "یفعل" کو کافی سمجھیں گے۔ کلام عرب اور قرآن مجید دونوں میں اس کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں، چند مثالیں ہم

قرآن سے پیش کرتے ہیں۔

سورۂ ہود میں ہے۔

فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ مَا يَعْبُدُونَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُهُم مِّن قَبْلُ (۱۰۹- ھود)	پس تم ان چیزوں سے شک میں نہ پڑو جن کو یہ پوجتے ہیں، یہ ان چیزوں کو نہیں پوجتے مگر اسی طرح جس طرح اس سے پہلے ان چیزوں کو ان کے باپ دادا پوجتے تھے۔

اس آیت میں دیکھئے کہ کان یعبد کی بجائے صرف "کما یعبد" فرمایا۔ کان کو حذف کر دیا۔

اسی طرح سورۂ زخرف میں ہے۔

وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِن نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِينَ وَمَا يَاْتِيهِم مِّن نَّبِيٍّ اِلَّا كَانُوا بِهٖ يَسْتَهْزِءُونَ (۶-۷، زخرف)	اور ہم نے کتنے نبی بھیجے اگلوں میں، اور نہیں آتا تھا ان کے پاس کوئی نبی مگر وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔

اس میں "وما یاتیھم" دراصل "وما کان یاتیھم" ہے لیکن عربی اسلوب کے مطابق "کان" کو حذف کر دیا۔

سورۂ انعام میں ہے

وَكَذٰلِكَ نُرِيٓ اِبْرٰهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۷۵- انعام)	اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کے کارخانہ کا مشاہدہ کراتے تھے۔

یہاں غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ "نری ابراھیم" دراصل "کنا نری ابراھیم" ہے لیکن عام اسلوب کے مطابق مضارع سے پہلے "کنا" محذوف ہو گیا۔

اسی اسلوب کے مطابق آیت زیر بحث میں "قد نری" دراصل "قد کنا نری" ہے۔ ترجمہ میں ہم نے اس حذف کو کھول دیا ہے اس لئے کہ اردو میں حذف کا یہ اسلوب موجود نہیں ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ہم تمہارے چہرے کی گردش آسمانوں کی طرف دیکھتے رہے تھے کہ تمہیں تحویل قبلہ کے لئے شدت سے انتظار ہے تو ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم تمہیں اس قبلہ کی طرف پھیر

دیں گے جس کو تم پسند کرتے ہو۔

اوپر یہ بات گزر چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ میں رہے اس وقت تک تو دونوں قبلوں کو جمع کر لینا ممکن رہا لیکن مدینہ ہجرت فرما جانے کے بعد یہ صورت باقی نہیں رہی۔ اس وجہ سے قبلہ ابراہیمی سے یہ انقطاع آپ پر شاق گزرنے لگا۔ بالخصوص جب وحی الٰہی کے ذریعہ سے آپ پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ آپ ملت ابراہیم پر مبعوث ہوئے ہیں۔ آپ کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا فرمائی تھی۔ نیز حضرت ابراہیم کا قبلہ ہی درحقیقت تمام اولاد ابراہیم کا مشترک قبلہ ہے تو برابر آپ کو تحویل قبلہ کا انتظار رہنے لگا اور جیسا کہ قاعدہ ہے اگر کسی کا انتظار ذوق و شوق کے ساتھ ہو تو بار بار نگاہ دروازے کی طرف اٹھ جاتی ہے اسی طرح آپ کی نظر بار بار اوپر آسمان کی طرف اٹھ جاتی۔ اس لئے کہ حضرت جبریل امین کا ظہور اسی طرف سے ہوتا تھا۔

فلنولینک کے لفظ میں اس فیصلہ کا اظہار ہے جو اللہ تعالیٰ نے تحویل قبلہ کے بارے میں فرمایا۔ میں نے ترجمہ میں لفظ کے اس مخفی مضمون کو کھول دیا ہے لیکن ضرورت اس پر بعض نظائر کے حوالہ کی تھی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے بعض نظائر کی طرف اشارہ کیا تھا مگر افسوس ہے کہ دم تحریر میرے پاس حوالہ کی ضروری کتابیں موجود نہیں ہیں۔ ممکن ہے کتاب کی طباعت کے موقع پر میں اس کمی کی تلافی کر سکوں۔

| فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ | شطر کے

معنی جہت، جانب اور طرف کے ہیں۔ مسجد حرام سے مراد وہ مسجد محترم ہے جو بیت اللہ کو اس کی ہر جہت سے ہالہ کی طرح اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے۔ قبلہ تو دراصل بیت اللہ ہی ہے چنانچہ مسجد حرام کے اندر لوگ ہر چہار طرف سے بیت اللہ ہی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں لیکن باہر والوں کے لئے یہ مسجد بھی قبلہ ہی کے حکم میں داخل ہے۔ اس طرح امت کے لئے قبلہ کے معاملہ میں تھوڑی سی وسعت اور آسانی پیدا کر دی گئی ہے۔ جس طرح اصل قربان گاہ تو دراصل مروہ ہے لیکن امت کی آسانی کے لئے اس کو منیٰ تک وسعت دے دی گئی ہے۔

ہمارے نزدیک یہی آیت ہے جس نے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنے کی اس اجازت کو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شروع شروع میں دی گئی تھی، منسوخ کیا اور اس کی جگہ مسجد حرام

کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا۔ اس حکم کے ساتھ یہ جو فرمایا کہ تم جہاں کہیں بھی ہو تو اپنے رخ اسی کی طرف کرو، یہ مسلمانوں کو اس غلطی سے بچانے کے لئے ہدایت دی گئی ہے جس میں یہود و نصاریٰ مبتلا ہو گئے تھے۔ اوپر آیت ۱۱۵ کی وضاحت کرتے ہوئے ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہود و نصاریٰ بیت المقدس کے اندر تو بیت المقدس کو قبلہ بناتے تھے لیکن اس سے باہر نکل کر ان کا قبلہ مشرق یا مغرب بن جاتا۔ اس امت کو اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی گمراہی سے بچانے کے لئے یہ ہدایت فرمائی کہ تم جہاں کہیں بھی ہو، مسجد حرام کے اندر یا باہر، نمازوں کے اوقات میں تمہارا رخ اسی قبلہ ہی کی طرف ہونا چاہیئے۔

یہاں خطاب کی اس تبدیلی پر بھی نگاہ رکھنی چاہیئے جو اس آیت میں نہایت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ پہلے تو خطاب واحد کے صیغہ سے ہے۔ "فول وجھك" پھر جمع کی صورت میں فرمایا فولوا وجوھکم۔ اس تبدیلی کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ پہلا خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بحیثیت امت کے وکیل کے ہے۔ اس دوسرے خطاب نے پہلے خطاب کے اس مضمر پہلو کو واضح کر دیا کہ اگرچہ وہ خطاب بظاہر ہے تو واحد کے صیغہ سے لیکن صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے نہیں ہے بلکہ اس میں پوری امت شامل ہے۔ علاوہ ازیں پہلے خطاب کے واحد کے صیغہ سے ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آپ کو تحویل قبلہ کے لئے جیسا کہ اوپر اشارہ ہے نہایت اضطراب تھا۔ یہ چیز مقتضی ہوئی کہ پہلے خاص طور پر آپ کو مخاطب کر کے اس تبدیلی کی بشارت دی جائے۔

| وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ | أَنَّهُ

سے مراد یہاں مسجد حرام کا اس امت کے لئے قبلہ ہونا ہے۔ اس بات کا حق ہونا اور خدا کی طرف سے ہونا اہل کتاب پر بالکل واضح تھا۔ اس لئے کہ اوپر جو تفصیلات قرآن نے پیش کی ہیں۔ ان سے مندرجہ ذیل باتیں واضح طور پر سامنے آگئی ہیں۔

ایک یہ کہ یہود کو یہ بات معلوم تھی کہ بیت اللہ حضرت ابراہیم و حضرت اسمٰعیل کی تعمیر ہے اور یہی بیت اللہ تمام ذریت ابراہیم کا اصلی قبلہ رہا ہے۔

دوسری یہ کہ آخری نبی ذریت اسمٰعیل میں پیدا ہوں گے اور ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ ایک

امت مسلمہ برپا کرے گا۔

تیسری یہ کہ اس ذریت اسمٰعیل کا مرکز اور قبلہ شروع سے یہی بیت اللہ رہا ہے۔

ان تمام باتوں کے اشارات و قرائن تورات میں موجود تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور اور آپ کے واقعات زندگی سے ہر قدم پر ان اشارات و قرائن کی تصدیق ہو رہی تھی۔ لیکن یہود اس حسد اور عناد کے سبب سے جو ان کو بنی اسمٰعیل اور مسلمانوں سے تھا، جانتے بوجھتے ان ساری باتوں کو چھپاتے تھے۔ ان کے اسی کتمانِ حق پر بانداز تہدید یہ فرمایا ہے کہ "جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے" یعنی یہ اپنے اس کتمانِ حق کی قرار واقعی سزا پاکے رہیں گے۔

وَلَئِنْ أَتَيْتَ الَّذِينَ ...... إِنَّكَ إِذًا لَّمِنَ الظَّالِمِينَ | یہ آیت بطور التفات کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دے رہی ہے کہ قبلہ کے معاملہ میں اہل کتاب کا یہ رویہ کسی شک شبہ کی بنا پر نہیں ہے بلکہ جیسا کہ اوپر واضح ہوا، دیدہ دانستہ محض ضد و عناد اور حسد کی بنا پر ہے اس وجہ سے اگر تم ان کو دنیا جہان کے تمام معجزے بھی دکھا دو جب بھی یہ تمہارے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں ہیں۔ ان کو مطمئن کرنے والی کوئی چیز ہو سکتی ہے تو دلائل و معجزات نہیں بلکہ یہ کہ تم خود ان کے قبلہ کی پیروی کرنے والے بن جاؤ لیکن حق کے اچھی طرح واضح ہو چکنے کے بعد تمہارے لئے اس کا کوئی امکان باقی نہیں رہا کہ تم ان کے قبلہ کی پیروی کر سکو۔ پھر یہ بات بھی واضح فرما دی کہ یہ ضدم ضدا کا رویہ کچھ تمہارے ہی ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ یہود و نصاریٰ خود ایک دوسرے کے قبلہ کی بھی پیروی نہیں کر سکتے۔ اب یہ مشرق و مغرب کے جس جھگڑے میں پڑ گئے ہیں یہ جھگڑا ختم ہونے والا نہیں۔ اور جب ایک ہی قبلہ کی پیروی کے یہ مدعی آپس میں متحد نہیں ہو سکتے تو تمہارے قبلہ کی پیروی بھلا یہ کس طرح کر سکتے ہیں؟

آخر میں فرمایا کہ علم وحی کے آجانے کے بعد اگر تم ان کی خواہشوں کی پیروی کرو گے تو تم بھی ظالموں میں سے بن جاؤ گے۔ یہ ایک نوع کی تہدید ہے جس کا ظاہر خطاب تو آنحضرت صلعم سے ہے لیکن اس کا رخ درحقیقت یہود و نصاریٰ کی طرف ہے۔ یہاں "العلم" سے مراد علم حقیقی ہے جو وحی کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے اور اھواء سے مراد اہل کتاب کی بدعتیں ہیں۔ ان دونوں

لفظوں کا مفہوم آیت ۱۲۰ کے تحت ہم واضح کر چکے ہیں۔

الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ ..... وَهُمْ يَعْلَمُونَ | الذین آتیناھم الکتاب سے مراد یہاں صالحین اہل کتاب کا گروہ ہے جو اپنے علم کے حد تک اپنے دین پر قائم اور ان تمام پیشینگوئیوں کے ظہور کا دل سے متمنی تھا جو آخری بعثت سے متعلق ان کے صحیفوں میں موجود تھیں۔ اس سے صالحین اہل کتاب مراد لینے کے وجوہ و دلائل پوری تفصیل کے ساتھ ہم آیت ۱۲۱ کے تحت واضح کر چکے ہیں۔

"یعرفونہ" میں ضمیر کا مرجع قرآن مجید اور اس کا یہ بیان ہے جو اس نے آخری بعثت اور اس کے قبلہ سے متعلق انہیں دیا ہے۔ یہ آیت بعینہٖ انہی الفاظ میں سورۂ انعام میں بھی وارد ہے الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ ۔ ۲۰ انعام (جن کو ہم نے کتاب عنایت کی وہ اس کو پہچانتے ہیں جیسا کہ وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں)

بیٹوں کی طرح پہچاننے میں یہ تشبیہ مضمر ہے کہ جس طرح ایک مہجور باپ اپنے دور افتادہ بیٹے کے لئے پریشان و مضطرب رہتا ہے اور ایک مدت کی جدائی کے بعد جب وہ آتا ہے تو دور سے اس کے پیراہن کی خوشبو اس کے لئے نوید مسرت لاتی ہے اسی طرح یہ صالحین اہل کتاب آخری بعثت سے متعلق تمام پیشینگوئیوں کے ہر مصداق سے اچھی طرح آشنا ہیں اور ان میں سے جو مصداق بھی ان کے سامنے ظاہر ہوتا ہے وہ اس کا خیر مقدم یوسف گم گشتہ کی طرح کرتے ہیں۔ سچے اہل کتاب کے اندر موعود و منتظر حق کے لئے انتظار و شوق کا جو جذبہ تھا اس کی تعبیر قرآن مجید نے ایک اور مقام میں اس طرح فرمائی ہے۔ وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ۸۳ ۔ مائدہ (اور جب وہ اس چیز کو سنتے ہیں جو رسول کی طرف اتاری گئی ہے تو تم دیکھتے ہو کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اس حق کی وجہ سے جس کو وہ اس کے اندر پہچانتے ہیں۔ وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم کو حق کی شہادت دینے والوں کے ساتھ لکھ)

الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ | الحق ہمارے نزدیک خبر ہے اور مبتدا

اس کا محذوف ہے۔ اگر مبتدا کو واضح کر دیا جائے تو پوری بات یوں ہوگی۔ هٰذَا هُوَ الْحَقُّ۔ یعنی یہی بات حق ہے۔ من ربک خبر سے متعلق ہے۔ مبتدا کو عموماً عربی میں اس موقع پر حذف کر دیتے ہیں جہاں مخاطب کی پوری توجہ خبر پر مرکوز کر دینی ہو۔ الحق آیت ۱۴۴ میں خبر ہی کے محل میں وارد ہے۔ اور اسی حیثیت سے وہ آیت ۱۴۹ میں بھی آیا ہے فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ کا خطاب ظاہر میں آنحضرت صلعم کی طرف ہے لیکن تنبیہ و عتاب کا رخ مخالفین کی طرف ہے ملاحظہ ہو آیت نمبر[لہ] ۱۴۵۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ..... قَدِيْرٌ | کل کا لفظ اگرچہ لفظاً نکرہ ہے لیکن عموماً اس سے مراد وہ خاص گروہ یا اشخاص ہی ہوتے ہیں جن کا ذکر کلام میں اوپر گزر چکا ہوتا ہے مثلاً وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ۴۹۔ مریم (ہم نے اس کو عطا کئے اسحٰق اور یعقوب اور ان میں سے ہر ایک کو نبی بنایا) وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِدْرِيْسَ وَذَا الْكِفْلِ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ۸۵۔ انبیاء (اور اسمٰعیل، ادریس اور ذوالکفل، ان میں سے ہر ایک صابروں میں سے تھا)

چنانچہ یہاں بھی کلٌ سے مراد یہود و نصاریٰ کے وہی گروہ ہیں جن کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے۔ ان کے متعلق فرمایا ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے قبلہ کے لئے ایک جہت ٹھہرائی ہے۔ کسی نے مشرق، کسی نے مغرب، یہ اپنی اسی ٹھہرائی ہوئی جہت ہی کو قبلہ بنائیں گے، تم کتنا ہی زور لگاؤ یہ پتھر کسی طرح اپنے مقام سے کھسکنے والے نہیں ہیں۔ اس وجہ سے تم ان کے پیچھے اپنی راہ کھوٹی نہ کرو بلکہ خدا کی دکھائی ہوئی صراط مستقیم پر آگے بڑھو اور نیکیوں اور بھلائیوں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔

گویا وہی بات جو اوپر والی آیت میں فرمائی تھی کہ وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ الآية اس آیت میں ایک دوسرے اسلوب سے فرما دی۔ مقصود اس سے ہرگز ہرگز قبلہ کے معاملہ میں کسی رواداری کا اظہار نہیں ہے بلکہ یہود و نصاریٰ کے رویہ سے بیزاری کا اظہار ہے، مسلمانوں کو اس بات کی نصیحت کی جا رہی ہے کہ ان جامدوں

لہ خطاب کے مختلف پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے مناسب ہے کہ مولانا فراہیؒ کے مقدمہ تفسیر میں خطاب کی فصل غور سے پڑھیے۔ تفسیر سورہ عبس بھی اس مقصد کے لئے مفید ہے گی۔

اور ہٹ دھرموں کو ان کے حال پر چھوڑو اور تم حصولِ سعادت کی راہ میں آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔

فاستبقوا کا مصدر استباق ہے جس کے معنی ہیں دوڑ میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے ہوئے سبقت لے جانے کی کوشش کرنا مثلاً اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ ۱۷۔ یوسف (ہم دوڑ میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے ہوئے دور نکل گئے) جس طرح دوڑ کے مقابلوں میں ایک نشان ٹھہرا کر ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں اسی طرح قبلۂ عبدیت و انابت اور فلاح و سعادت کی جد و جہد میں مقابلہ کے لئے خدا کا مقرر کردہ ایک نشان یا گول ہے۔ اس نشان کو، جیسا کہ اوپر تفصیل گزر چکی ہے، پچھلی امتوں نے ضائع کر دیا تھا اس وجہ سے ان کی بھاگ دوڑ بھی بالکل دوسری وادیوں میں ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس نشانِ حق کو امتِ وسط کے لئے پھر نمایاں کیا اور اس کو دعوت دی کہ اگر دوسرے اس میدان میں اترنے کے لئے تیار نہیں ہیں تم ان کو ان کے حال پر چھوڑو اور تم اپنی سرگرمیوں سے اس میدان کو پھر گرم کرو۔

قبلہ کے متعلق یہ بات کہ وہ فلاح و سعادت کے حصول کے لئے ایک نشان اور علم کی حیثیت رکھتا ہے محض کوئی استعارہ نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے، اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لئے اس عظیم تاریخ کو حافظہ میں از سر نو تازہ کرنے کی کوشش کیجئے جو اس گھر کے ایک ایک پتھر پر نقش ہے جس کو قبلہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ گھر وہ گھر ہے جس کی تعمیر ابراہیم خلیل اللہؑ اور اسمٰعیل ذبیح اللہؑ نے اپنے مقدس ہاتھوں سے کی ہے۔ یہ گھر وہ گھر ہے جو اس دنیا کے بتکدے میں خدائے واحد کی عبادت کا اولین مرکز ہے، اسی گھر کے پہلو میں مروہ پہاڑی ہے جس کے دامن میں چشم فلک نے رضائے الٰہی کے لئے بوڑھے باپ کو محبوب اور اکلوتے فرزند کی گردن پر چھری چلاتے اور اسلام کی حقیقت کا مظاہرہ کرتے دیکھا ہے، یہی گھر ہے جس کے ارد گرد کے چٹیل میدانوں کو قدرت نے اس امتِ مسلمہ کے نشو و نما کے لئے منتخب فرمایا جس کے ذریعے سے دنیا کی تمام قوموں کو خدا کی رحمت تقسیم ہونے والی تھی، یہی گھر ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے لے کر برابر تمام قدوسیوں کا قبلہ رہا ہے اور جس میں طواف و اعتکاف اور رکوع و سجود کی سعادت اتنے انسانوں نے حاصل کی ہے کہ جس طرح زمین کے ذروں اور آسمان کے تاروں

کا شمار ناممکن ہے اسی طرح ان نفوسِ قدسیہ کا شمار بھی ناممکن ہے۔ اسی کے قرب میں وہ میدان ہے جس کی ریت کا ایک ایک ذرہ توبہ و استغفار کے سجدوں کا گواہ اور خوفِ خدا سے رونے والوں کے آنسوؤں کا امین ہے۔ اسی گھر کے ایک کونے میں وہ مقدس پتھر ہے جس کو خدا کے دہنے ہاتھ سے تشبیہ دی گئی ہے اور جس کو ہاتھ لگا کر یا بوسہ دے کر لاکھوں کروڑوں انبیاء و صدیقین اور صلحاء و ابرار نے اپنے رب سے عہدِ بندگی و وفاداری استوار کیا ہے۔ اسی کے پاس وہ جمرات ہیں جو اس گھر کے دشمنوں کی ذلت و پامالی کی یادگار ہیں اور جن پر سنگ باری کر کے اہلِ ایمان اپنے اندر برابر اعدائے دین کے خلاف جہاد کی روح تازہ کرتے رہتے ہیں۔ اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اسی گھر کے سایہ میں خدا کے آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پرورش پائی جن کے لائے ہوئے نور اور جن کی بخشی ہوئی ضیاء نے تمام دنیا میں اجالا کر دیا۔

ایک ایسی عظیم روایات کے امین گھر کو قبلہ بنانے کے معنی یقیناً یہی ہیں کہ اس کو ایک نشان قرار دے کر ان روحانی خزانوں کے حصول کے لئے جدوجہد کی جائے جو سیدنا ابراہیمؑ سے لے کر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک اس گھر کو ودیعت ہوئے یا دوسرے لفظوں میں اس کو ایک پاور ہاؤس سمجھئے جس سے پوری امت زندگی، حرارت، روشنی اور قوت حاصل کرتی ہے۔ جن لوگوں پر قبلہ کی عظمت و اہمیت کا یہ پہلو واضح نہیں ہے وہ اکثر اس امر پر حیران ہوتے ہیں کہ اینٹ اور پتھر کے بنے ہوئے ایک مکان کو دین میں اس درجہ اہمیت کیوں دے دی گئی ہے لیکن اوپر کی تفصیل سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ اصل اہمیت اینٹ پتھر کے مکان کی نہیں بلکہ ان عظیم روایات کی ہے جو اس گھر سے وابستہ ہیں اور جو اس دنیا کی روحانی و ایمانی زندگی کا واحد ذریعہ ہیں۔ ان روایات کی وجہ سے ملت کے نظامِ اجتماعی میں اس گھر کو وہی اہمیت حاصل ہے جو ایک جسم کے نظام میں قلب کو حاصل ہوتی ہے۔ جس طرح قلب کے بغیر جسم کا وجود نہیں اسی طرح قبلہ کے بغیر ملت کا کوئی تصور نہیں۔ یہاں قبلہ سے متعلق ان اجمالی اشارات پر کفایت کرتے ہیں۔ آگے مناسب مواقع پر ہم اس کی اہمیت کے بعض دوسرے گوشوں پر بھی نظر ڈالیں گے۔

أَيْنَ مَا تَكُونُوا يَأْتِ بِكُمُ اللَّهُ جَمِيعًا إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ کے دو

مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس قبلہ کو قبلہ قرار دے کر جہاں کہیں سے بھی تم نیکی اور بھلائی کی راہ میں کوئی جدوجہد کرو گے وہ ضائع نہیں جائے گی۔ خدا تم کو ہر جگہ سے اکٹھا کرے گا اور تمہیں تمہاری ہر چھوٹی بڑی نیکی کا بدلہ دے گا۔ یہ استباق الی الخیر کے لئے ایک نشان کی طرح ہے۔ اس سے قرب و بُعد دل کے تعلق کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ ہر شخص ہر جگہ اس سے ربط قائم کر سکتا ہے اور اللہ اس سے تعلق رکھنے والوں کو ہر جگہ سے جمع کر سکتا ہے۔

دوسرا یہ کہ جو جس سمت بھی رخ کرنا چاہتا ہے اس کو کرنے دو، تم ان بحثوں میں الجھنے کی بجائے نیکی اور بھلائی کی راہوں میں بڑھو۔ ایک دن آئے گا جب اللہ تم سب کو جمع کر کے فیصلہ کرے گا کہ کون حق کی راہ چلا اور کس نے ضد اور ہٹ دھرمی کی روش اختیار کی۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ ...... وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ | اوپر آیت ۴۲

میں تحویلِ قبلہ کے اصل حکم کے ضمن میں یہ بات تو واضح ہو گئی تھی کہ آدمی جہاں کہیں بھی ہو قبلہ ہی کی طرف رخ کرے لیکن سفر کی حالت سے متعلق وہاں کوئی تصریح نہیں تھی کہ اس صورت میں بھی اس حکم کی پابندی ضروری ہے یا اس میں کچھ ڈھیل ہے۔ سفر کی حالت میں کسی تعین قبلہ کی جستجو اور تحقیق ایک دشوار کام ہے۔ اس وجہ سے خیال یہی ہوتا ہے کہ یہاں کوئی پابندی نہیں ہونی چاہیئے۔ لیکن اوپر قبلہ کی جو اہمیت بیان ہوئی ہے اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کسی حالت میں بھی اس روحانی پاور ہاؤس سے انسان کا تعلق منقطع نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر سفر کی حالت میں آزادی دے دی جاتی تو اس سے قبلہ کے معاملہ میں اس گمراہی کو اچھی خاصی راہ مل جاتی جس میں یہود و نصاریٰ مبتلا ہوئے۔ اس وجہ سے اس امت کو واضح الفاظ میں اس بات کی تاکید کی گئی کہ حضر کی طرح سفر میں بھی قبلہ کا اہتمام ضروری ہے تاکہ امت اپنے اصل نصب العین سے کسی حالت میں بھی سہل انگاری میں مبتلا نہ ہونے پائے۔

اس تاکید کے ساتھ ساتھ یہ تنبیہ بھی فرما دی کہ یہی قبلہ خدا کا مقرر کیا ہوا واقعی قبلہ ہے، سو اس بات کو یاد رکھنا کہ اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔ یہ تنبیہ عذرِ سفر کی بنا پر قبلہ کے معاملہ میں ہر قسم کی ارادی بے پروائی اور ہر قسم کی منافقانہ سہولت تراشی کی جڑ کاٹتی ہے۔ اس کے شروع میں خطاب واحد کے صیغہ سے ہے اور آخر میں جمع کے صیغہ سے، یہ اس

حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ شروع کا خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بحیثیت امت کے وکیل کے ہے، مراد اس سے پوری امت ہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ سفر کی حالت میں چونکہ بسا اوقات قبلہ کا تعین سخت مشکل ہو جاتا ہے اس وجہ سے جو چیز شریعت میں مطلوب ہے وہ صرف موجود وسائلِ تحقیق کے حد تک قبلہ کی جستجو ہے، اسلام نے کسی معاملہ میں طاقت سے زیادہ امت پر کوئی بوجھ نہیں ڈالا ہے۔ بس میسر وسائل تحقیق سے جو ظن غالب حاصل ہو جائے آدمی اسی کے مطابق نماز ادا کرے۔ یہ پابندی کسی صورت میں بھی ان رخصتوں کی نفی نہیں کرتی جو مجبوریوں کی حالت میں شریعت نے امت کو دی ہیں اور جن کی تصریح حدیث و فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ ...... وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ | اوپر سفر اور حضر دونوں حالتوں سے متعلق یہ دونوں حکم بیان ہو چکے ہیں۔ اس وجہ سے انہی دونوں حکموں کا معاً یہ اعادہ بعینہٖ انہی الفاظ میں اپنے اندر بظاہر کچھ تکرار کی سی گرانی رکھتا ہے اور یہ چیز قرآن میں، جو ایجاز و بلاغت کا ایک معجزہ ہے، طبیعت کو کچھ کھٹکتی ہے لیکن یہ کھٹک محض قلت تدبر کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ یہاں ان احکام کے دہرانے سے مقصود ہرگز ہرگز ان احکام کو دوبارہ بیان کرنا نہیں ہے بلکہ ان کی ان تین عظیم حکمتوں اور مصلحتوں کو بیان کرنا ہے جو ان احکام کے اندر اس امت کے لئے پیش نظر ہیں اور جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ یہ حکمتیں بحیثیت مجموعی دونوں ہی حکموں سے جیسا کہ آگے واضح ہوگا، تعلق رکھتی ہیں اور ان سے معمولی بے خبری یا بے پروائی بھی اس امت کو ایسی غلطیوں میں مبتلا کر سکتی ہے جن کی اصلاح کی کوئی صورت ہی باقی نہیں رہ جائے گی۔ اس وجہ سے قرآن نے ان حکمتوں کے بیان سے پہلے تمہید کے طور پر ان احکام کی طرف ذہنوں کو پھر متوجہ کر دیا کہ اس شد و مد اور اس تاکید و تنبیہ کے ساتھ اندر اور باہر، سفر اور حضر، ہر جگہ اور ہر صورت میں بیت اللہ ہی کی طرف رخ کرنے کا جو حکم دیا جا رہا ہے یہ کوئی سرسری اور سطحی حکم نہیں ہے بلکہ نہایت عظیم مصلحتوں اور حکمتوں پر مبنی حکم ہے۔ اگر اس کو ٹھیک ٹھیک ملحوظ رکھنے میں

تم نے ذرا بھی سہل انگاری سے کام لیا اور اس سہل انگاری کے سبب سے ایک قدم بھی غلط اٹھایا تو تمہارا سارا سفر ہی ایک غلط سمت میں ہو جائے گا۔ اس وجہ سے ان کا پورا پورا اہتمام کرو اور ان کی حکمتیں اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔ اس تمہید کے بعد اب آگے یہ حکمتیں ان الفاظ میں بیان ہو رہی ہیں۔

لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ...... وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ | غور کیجئے تو واضح ہوگا کہ یہاں ان احکام کی تین حکمتیں بیان کی گئی ہیں ایک قطع حجت، دوسری اتمام نعمت، تیسری راہ یابی۔ اب ہم اختصار کے ساتھ ان تینوں کی تشریح کرتے ہیں تاکہ مذکورہ احکام کے اعادہ کا فائدہ اور نظمِ کلام اچھی طرح واضح ہو جائے۔

قطع حجت سے مراد یہ ہے کہ اہل کتاب بالخصوص یہود کے لئے بات بات میں تمہارے اوپر گرفت کرنے اور تمہارے خلاف بدگمانی پھیلانے کے لئے کوئی موقع باقی نہ رہ جائے۔ یہاں للناس سے مراد موقع کلام گواہ ہے کہ اہل کتاب ہیں۔ قبلہ کے اشتراک کی وجہ سے اہل کتاب بالخصوص یہود، قدم قدم پر، آنحضرت صلعم اور مسلمانوں کے خلاف یہ اعتراض اٹھاتے رہتے تھے کہ جب یہ ہمارے قبلہ ہی کی طرف نماز پڑھتے ہیں تو نماز اور عبادت کے طریقوں میں ہمارے طریقہ سے الگ راہ کیوں اختیار کرتے ہیں۔ ایک بنیادی چیز میں اشتراک کے بعد دوسری چیزوں میں اختلاف کو وہ نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی من گھڑت ایجاد قرار دیتے تھے۔ ان کا یہ پروپیگنڈا سادہ لوح لوگوں پر اثر انداز ہوتا تھا اور اس سے اس حقیقت کے واضح ہونے میں بڑی رکاوٹیں پیدا ہو رہی تھیں کہ حضورؐ کی بعثت یہودیت یا نصرانیت پر نہیں بلکہ ملت ابراہیم پر ہوئی ہے۔ اب وقت آگیا تھا کہ اس پروپیگنڈے کا پوری طرح سدِ باب کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے وہ رخنہ بندیاں ضروری ہوئیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ فرض کیجئے، یہ احتیاطیں نہ اختیار کی جاتیں، مسلمانوں کو آزاد چھوڑ دیا جاتا کہ جب وہ مسجد حرام سے باہر یا سفر کی حالت میں ہوں تو جس سمت کی طرف چاہیں نماز پڑھ لیا کریں تو قطع نظر اس سے کہ مسلمان قبلہ کے معاملہ میں اسی قسم کی گمراہی میں مبتلا ہو جاتے جس قسم کی گمراہی میں اہل کتاب مبتلا ہوئے، محض بعض حالات میں ظاہری اشتراک کی وجہ سے یہود مسلمانوں کے خلاف

زبان درازی اور وسوسہ اندازی کی کوئی نہ کو

رخنوں کو بند کر دیا۔ اگرچہ بشر پرو گ اس قط

لیکن دنیا میں کوئی احتیاط بھی ہر قسم کے لوگو

نے یہ بتایا ہے کہ فلا تخشوھم واخشو

اتمام نعمت سے مراد تکمیلِ دین کی د

حضرت عیسٰی علیہما السلام نے اس امت

نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اس فر

امتحان میں کامیاب ہوئے تھے۔ اس وقت

ایک عظیم امت پیدا ہوگی جس سے تمام د

سے اللہ تعالیٰ نے دنیا کے لئے

کا قبلہ وہ بیت اللہ قرار پایا جو تمام عالم

گیا تھا۔

راہ یابی سے مراد ہے اس صراط

اور فطری راہ ہے۔ جس کے متعلق فرمایا

مُّسْتَقِيمٍ دِينًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَ

رہنمائی ایک سیدھی راہ کی طرف فرمائی ہے

یک سو تھا، اس ملتِ ابراہیم کی طرف

ہیں، یہ قبلہ ہے اس وجہ سے ضروری

کے سامنے رہے۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا ....

حرف تشبیہ ہے، اس وجہ سے یہاں یہ سو

اس کا جواب یہ ہے کہ "کما" تقریباً اسی

لفظ استعمال کرتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ

کوئی پروا نہ کی۔ قرآن مجید میں اس کا حوالہ اس طرح دیا گیا ہے۔ اُذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَوْفُوا بِعَهْدِي أُوفِ بِعَهْدِكُمْ وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ

۴۰- بقرہ (میری اس نعمت کو یاد رکھو جو میں نے تم پر کی ہے۔ اور میرے عہد کو پورا کرو، میں اس عہد کو پورا کروں گا جو میں نے تم سے کیا ہے اور مجھی سے ڈرو)

بقیہ اصول تفسیر

۳- سورہ طلاق کی آیت ۱۰، ۱۱ کے الفاظ

قَدْ أَنْزَلَ اللَّهُ إِلَيْكُمْ ذِكْرًا رَسُولًا — خدا نے تمہاری طرف اپنا ذکر نازل فرمایا یعنی رسول

کی تاویل میں اشاعرہ، شیعہ اور بعض اہلحدیث نے ذکر کا مفہوم متعین کرنے میں خطا کی۔

۴- ثعلب کا ایک قول ہے کہ آیت

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ — آج ہم تیرے بدن کو بچالیں گے۔

میں ببدنک سے مراد بدرعک (تیری زرہ کو) ہے لوگوں کو فرعون کے غرق ہونے میں شک ہوا تو اللہ تعالیٰ نے سمندر کو حکم دیا کہ فرعون کی زرہ کو کسی ٹیلے پر پھینک دے جب سمندر نے اس حکم کی تعمیل کی تو لوگوں کو فرعون کے غرق ہونے کا یقین آگیا۔ اخفش کا قول ہے کہ جو شخص ببدنک سے ببدرعک مراد لیتا ہے اس کے اس قول کی کوئی بنیاد نہیں کیونکہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ جب تک کوئی قرینہ موجود نہ ہو بدن کے لفظ سے ذہن زرہ کی طرف منتقل نہیں ہوتا۔

آیت زیر بحث میں ایسا مفہوم لینے کا کوئی قرینہ نہیں ہے۔ پھر دوسرا پہلو یہ ہے کہ آدمی اپنے جسم اور شکل سے پہچانا جاتا ہے نہ کہ زرہ سے۔

اسی لئے اس آیت سے آگے ارشاد ہے۔

لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً — تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لئے نشانی ہو۔

(باقی)

مطالعہ حدیث

مولانا عبد الغفار حسن صاحب

حدیث کے ظنی ہونے کا مفہوم

(۲)

گذشتہ شمارے میں یقین و ظن کے مختلف مراتب اور تواتر کے اقسام کی وضاحت کی گئی تھی، ذیل کے مضمون میں متواتر کے علاوہ حدیث کی دوسری انواع کی تشریح کرتے ہوئے ظن و یقین کے لحاظ سے ان کا مقام متعین کیا گیا ہے۔ (ع-ح)

ایسی روایات جو راویوں کی تعداد کے لحاظ سے حد تواتر کو نہ پہنچ سکیں ان کو اخبار آحاد (خبر واحد) شمار کیا جاتا ہے۔ خبر واحد کی راویوں کی تعداد کے اعتبار سے چند قسمیں ہیں۔

۱- مشہور: ایسی روایت جس کے سلسلۂ سند میں شروع سے آخر تک (یعنی ہر دور میں) راویوں کی تعداد دو سے زیادہ ہو۔

۲- عزیز: ایسی حدیث جس کی تعداد رواۃ ہر دور میں دو سے کم نہ ہو۔

۳- غریب: ایسی روایت جس کی سند کسی دور میں یا تمام ادوار میں ایک راوی پر مشتمل ہو۔ واضح رہے کہ محدثین کے نزدیک اگر کسی روایت کی سند کے اکثر ادوار میں راویوں کی تعداد ہزاروں سے بھی متجاوز ہو لیکن کسی ایک دور میں ایک ہی راوی ہو تو اس روایت پر غریب ہی کا اطلاق ہوگا۔ یہی حال خبر واحد کی دوسری انواع کا بھی ہے، مثلاً بعض محدثین کی بعض روایات کی سند اس طرح ہے "عن احمد بن حنبل عن الشافعی عن مالک عن نافع عن ابن عمر عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم"، اس سند میں مؤلف کتاب

اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے درمیان چار واسطے پائے جاتے ہیں۔ اب اگر تین واسطوں کے ساتھ بہت سے راوی موجود ہوں لیکن ایک واسطہ بھی اپنی جگہ منفرد رہ جائے تو یہ حدیث غرابت سے خالی نہ ہوگی۔ اس قسم کی احادیث کے راوی اگر ثقہ اور قابلِ اعتماد ہوں تو یہ محدثین کے نزدیک قابلِ قبول ہوتی ہیں۔ لیکن خبر واحد کی ان انواع کو ظنی (مفید ظن) قرار دیا گیا ہے۔ یہاں ظن سے مراد گمان غالب ہے، جس کی سرحدیں علم و یقین سے انتہائی قریب ہوتی ہیں۔

شریعت اسلامیہ میں ان تمام ذرائع پر اعتماد کیا گیا ہے جن کی بنیاد گمان غالب پر ہوتی ہے۔ مثلاً قرآن مجید کی آیت وَاَشْهِدُوا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ کی روشنی میں دو عادل گواہوں کی شہادت پر اعتماد کیا گیا ہے اور اس شہادت کی بنا پر قتل جیسے فوجداری معاملات کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ اس شہادت کا درجہ سو فی صدی یقینی نہیں ہے، بلکہ جو کچھ بھی ہے وہ ظن (گمان غالب) ہی ہے۔ یہاں یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ جس مسلمان کی جان کا تحفظ (عصمت) قرآن اور سنت متواترہ کے ذریعہ ثابت ہے اسی کو دو عادل گواہوں کی شہادت کی بنا پر قتل کا مجرم قرار دیتے ہوئے قصاص میں پھانسی پر لٹکایا جا سکتا ہے۔

خبر واحد کا یقینی پہلو

محدثین کرامؒ نے جہاں خبر واحد کو مفید ظن کہا ہے وہاں یہ بھی وضاحت کر دی ہے کہ اگر خبر واحد کے ساتھ دوسرے قرائن و شواہد وابستہ ہوں تو یقین کا پہلو نکل آتا ہے۔ یعنی خبر واحد مشتمل بر قرائن و شواہد علم الیقین کا فائدہ دیتی ہے۔

اصولِ حدیث کی کتابوں میں ان قرائن و شواہد کی تین مثالیں دی گئی ہیں:

۱۔ بخاری و مسلم کی وہ تمام روایات جو محدثین کے نقد و تبصرے سے بالاتر رہی ہیں صحت و قوت اور قبولیتِ عام کے لحاظ سے ان کا درجہ ان روایات سے کہیں زیادہ بلند ہے جو صرف راویوں کی ثقاہت کی بنا پر قابلِ اعتماد ٹھہرائی گئی ہیں۔ ان دونوں کتابوں کو تلقی بالقبول (قبولیتِ عام) کا مقام حاصل ہونا، اور ان کی

صحت قابلِ اعتماد ہونے پر امت کا اجماع و اتفاق ہونا، ایسے مضبوط قرائن و شواہد ہیں کہ جن کی بنا پر یہ احادیث مفیدِ علم و یقین قرار پاتی ہیں۔

۲۔ حدیث مشہور بھی مفید علم و یقین ہے جب کہ وہ متعدد الگ الگ سندوں سے مروی ہو اور ہر قسم کی فنی خامی اور راویوں کے ضعف سے پاک ہو۔

۳۔ حدیث مسلسل بالائمۃ، یعنی ایسی حدیث جس کے راوی ہر دور میں مشہور اہل علم میں سے ہوں بشرطیکہ وہ اس حدیث کے بیان کرنے میں منفرد نہ ہوں بلکہ علم و تقوے کے لحاظ سے ان کی ہم پلہ کوئی دوسری شخصیت بھی ان کی ہم نوا ہو مثلاً امام احمد بن حنبل، امام شافعی سے روایت کریں اور وہ بھی امام مالک سے، ظاہر ہے ان تینوں بزرگوں کی ثقاہت اور علمی جلالت و عظمت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ اب اگر ان میں سے ہر امام کے ساتھ ایک دوسرا جلیل القدر عالم بھی شریک روایت ہو تو سہو و نسیان کا امکان انتہائی کم سے کم رہ جاتا ہے اور اگر مذکورہ بالا تینوں شکلیں کسی ایک ہی حدیث میں یکجا ہو جائیں تو اس صورت میں قطعیت اور یقین کا پہلو اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ یعنی جب ایک روایت صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں درج ہو، راویوں کی تعداد کے لحاظ سے مشہور ہو، اور راوی بھی اکابر ائمہ دین میں سے ہوں۔

ان کے علاوہ اور بھی قرائن و شواہد ہو سکتے ہیں جن کی تفصیل کی اس وقت ضرورت نہیں ہے۔

اس تفصیل سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ خبر واحد کی بھی متعدد انواع مفید علم الیقین ہیں۔ اب صرف وہ اخبار احاد رہ جاتی ہیں، جن کے راوی تقوے اور حافظے کے لحاظ سے تو قابلِ اعتماد ہیں لیکن دوسرے قرائن و شواہد سے ان کو تقویت اور تائید حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ ان روایات کو بھی صحت و قوت کے لحاظ سے مختلف مراتب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مثلاً صحیح لذاتہ، حسن لذاتہ، صحیح لغیرہ، حسن لغیرہ

۱۔ صحیح لذاتہ سے مراد وہ روایت ہے جس کے راوی عدالت (تقوٰی) اور قوتِ حافظہ

کے لحاظ سے قابلِ اعتماد ہوں، سند کی تمام کڑیاں باہمی متصل و مربوط ہوں، انقطاع کے نقص سے پاک ہوں اور ہر قسم کی ان فنی خامیوں سے مبرّا ہوں، جن کو فنِ حدیث کے ماہرین ہی جان سکتے ہیں، اسی طرح وہ روایت ہر قسم کے شذوذ سے پاک ہو (شذوذ کا مطلب محدثین کی اصطلاح میں یہ ہے کہ ثقہ راوی اپنے سے زیادہ قابلِ اعتماد راوی سے حدیث میں یا دو تین ثقہ راویوں سے سند یا متنِ حدیث کے بیان میں اختلاف کرے) یہ پانچ شرطیں جس حدیث میں پورے کمال کے ساتھ پائی جائیں وہ "صحیح لذاتہ" شمار ہو گی۔

۲۔ اگر تمام شرائط کے باوجود حافظہ کے لحاظ سے کچھ کمی پائی جاتی ہے تو اس روایت کو حسن لذاتہ کہا جاتا ہے۔

۳۔ "حسن لذاتہ" اگر کئی طرق (سندوں) سے مروی ہو تو اس کا نام صحیح لغیرہٖ ہے۔

۴۔ اگر کسی روایت میں ضعف کے متعدد وجوہ موجود ہوں، لیکن اس ضعف کی تلافی اس بنا پر ہو گئی ہو کہ وہ روایت کئی سندوں سے مروی ہے تو ایسی حدیث کو "حسن لغیرہٖ" کہا جاتا ہے۔ محدثین کرام نے کسی روایت کو غرابت یا ضعف سے پاک کرنے کے لئے توابع و شواہد کی جستجو کا بھی اہتمام کیا ہے

مثلاً ایک شخص مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اساتذہ کے واسطے سے ایک قول شاہ ولی اللہؒ کی طرف منسوب کرتا ہے، اب اگر تلاش و جستجو سے مولانا مرحوم کا کوئی دوسرا شاگرد بھی اس قول کا راوی نکل آتا ہے تو اسے محدثین کی اصطلاح میں تابع کہتے ہیں، لیکن اگر کسی دوسری سند مثلاً مولانا سید نذیر حسین رحمۃ اللہ علیہ کے واسطے سے اس قول کی تائید ہو جاتی ہے تو اسے شاہد کہتے ہیں، اصولِ حدیث میں توابع و شواہد کی جستجو کا نام اعتبار ہے۔ محدثین کے ہاں اس "اعتبار" کی بڑی قدر و قیمت ہے۔ انہوں نے انتہائی کوشش اور جانفشانی سے ہزاروں روایات کے شواہد و توابع کو ڈھونڈھ نکالا ہے۔ اس لئے پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ احکام و مسائل کے بارے میں شاید ہی ایسی

کوئی منفرد روایت ہو جس کے توابع و شواہد کا کھوج محدثین نے نہ لگا لیا ہو۔ جزاہم اللہ عنا وعن سائر المسلمین خیرا۔

ان شواہد و توابع، کی بنا پر بہت سی غریب یا حسن روایات گمان غالب سے بڑھ کر یقین کے درجہ تک پہنچ گئی ہیں۔

چند شبہات

علم حدیث پر مسلمانوں کو جو وثوق و اعتماد ہے اس کو متزلزل کرنے اور ذخیرۂ روایات کو مشکوک ٹھہرانے کے لئے منکرینِ سنت کی طرف سے متعدد شبہات پھیلائے گئے ہیں۔

ایک لاکھ روایات

کہا جاتا ہے کہ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب صحیح بخاری جو سات ہزار روایات پر مشتمل ہے، کا انتخاب ایک لاکھ احادیث میں سے کیا تھا، امام بخاریؒ کا اتنی بڑی تعداد کو نظر انداز کر دینے کے معنی یہ ہیں کہ تیسری صدی ہجری تک احادیث کے نام سے بہت سی رطب و یابس روایات کا اضافہ کر دیا گیا تھا، ظاہر ہے کہ اتنے بڑے انبار میں سے اصل حقیقت کا سراغ لینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ایک لاکھ کا عدد پیش کرتے ہوئے جو مغالطہ دیا جاتا ہے اس کی اصلیت معلوم کرنے کے لئے مندرجہ ذیل حقائق پیش نظر رہنے چاہئیں۔

۱۔ محدثین کی اصطلاح میں اگر ایک متنِ حدیث متعدد سندوں سے آیا ہے تو یہ متن اپنی ہر سند کے لحاظ سے ایک حدیث شمار ہوتا ہے۔ مثلاً مشہور حدیث انما الاعمال بالنیات سات سو سندوں سے مروی ہے یعنی ایک حدیث کے سینکڑوں توابع و شواہد ہیں۔ فنِ حدیث میں یہ ایک حدیث نہیں بلکہ سات سو حدیثیں شمار ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب امام بخاریؒ کی ایک ہی حدیث کی سندیں سینکڑوں تک پہنچتی ہوں تو باقی روایات کے توابع و شواہد کی تعداد کہاں تک پہنچے گی۔ اس کا اندازہ بآسانی کیا جا سکتا ہے۔ قیاس کن زگلستان من بہار مرا۔ (تنقیح ابن الجوزی مقدمہ ابن الصلاح ص۱۱)

واضح رہے کہ محدثین کی تحقیق کے مطابق تمام رطب و یابس روایات پچاس ہزار سے زیادہ نہیں ہیں، امام حاکم کا قول ہے کہ صحت و قوت کے لحاظ سے اعلیٰ درجہ کی

احادیث کی تعداد دس ہزار کے قریب ہے۔

۲۔ محدثین "حدیث" کا وسیع مفہوم لیتے ہوئے اس کا اطلاق صحابہ اور تابعین کے آثار و اقوال پر بھی کر دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ امام بخاریؒ نے ایک لاکھ میں سے خالص مرفوع احادیث یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین اور اسوۂ حسنہ پر مشتمل روایات کو چھانٹ لیا۔ ظاہر ہے کہ امام محترم کا یہ طرزِ عمل امتِ اسلامیہ پر ایک بہت بڑا احسان ہے نہ کہ حدیث کے بارے میں وسوسہ اندازی کا موجب۔

۳۔ قرآنی کلمات "ماعون" کی تفسیر میں صحابہ اور تابعین سے سات قول اور نعیم (سورہ تکاثر) کے بارے میں دس قول منقول ہیں، اہلِ علم کے ہاں ہر قول پر لفظ حدیث کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ مقدمہ فتح الملہم صہ ۲

اس ساری تفصیل سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ایک لاکھ کے عدد کو ہوّا بنا کر پیش کرنا کس قدر مغالطہ انگیز ہے۔

روایت بالمعنیٰ

دوسرا شبہ روایت بالمعنیٰ کی بنیاد پر پیش کیا جاتا ہے۔ یعنی استاذ اپنے شاگرد کی طرف ان الفاظ کو منتقل نہیں کرتا جو اس نے اپنے استاذ سے سنے ہیں بلکہ ان کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں پیش کرتا ہے۔ اس طرح بہت سے معانی اور مطالب میں تبدیلی واقع ہو سکتی ہے۔

۱۔ روایت بالمعنیٰ فی نفسہٖ ناجائز یا قابلِ نفرت نہیں ہے، خود قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ایک ہی قصہ کو اور ایک ہی شخص یا گروہ کی گفتگو کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت بیان کرتے ہوئے ایک جگہ ارشاد ہوا۔ هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ مُوسَىٰ، إِذْ رَأَىٰ نَارًا فَقَالَ لِأَهْلِهِ امْكُثُوا إِنِّي آنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّي آتِيكُم مِّنْهَا بِقَبَسٍ أَوْ أَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى۔ (پ ۱۶ سورہ طٰہٰ ع ۱) دوسری جگہ فرمایا۔

قَالَ لِأَهْلِهِ امْكُثُوا إِنِّي آنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّي آتِيكُم مِّنْهَا بِخَبَرٍ أَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ (پ ۲۰ سورہ قصص ع ۳)

تیسرے مقام پر ارشاد ہوا۔

إِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِأَهْلِهِ إِنِّي آنَسْتُ نَارًا سَآتِيكُم مِّنْهَا بِخَبَرٍ أَوْ آتِيكُم بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ (پ ۱۹ سورہ النمل ع ۱)

اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کی سرگزشت میں ایمان لانے والے جادوگروں کی گفتگو متعدد مقامات پر مختلف الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ اصل مفہوم سب جگہ ایک ہے لیکن الفاظ میں تفاوت پایا جاتا ہے۔

۲۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات کا بہت بڑا حصہ بعینہٖ الفاظِ نبوی کے ساتھ منقول ہے۔ مثلاً اذان و اقامت کے کلمات، اذکار و ادعیہ کے الفاظ اور احادیثِ قدسیہ۔

ان کے علاوہ احکام و اخلاق کے متعلق احادیث کا دو تہائی حصہ فعلی اور تقریری روایات پر مشتمل ہے (تقریر کے معنیٰ ہیں کہ آپ کے سامنے کوئی کام کیا گیا ہو اور اس پر آپ نے انکار نہ فرمایا ہو) روایت بالمعنیٰ کا اگر سوال پیدا ہو سکتا ہے تو وہ صرف قولی احادیث کے بارے میں ممکن ہے۔ اس طرح پورے ذخیرۂ روایات پر غور کرنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جن احادیث میں روایت بالمعنیٰ کا احتمال ممکن ہے وہ ایک ثلث سے زیادہ نہیں ہیں۔ روایت بالمعنیٰ کو جائز قرار دیا گیا ہے تو اس کے لئے محدثین نے بڑی شرطیں لگائی ہیں، یعنی یہ طریق کار وہی لوگ اختیار کر سکتے ہیں جو زبان کے ماہر اور لغت کی وسعتوں پر پوری طرح قابو پا سکتے ہوں۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں۔ ولا یجوز تعمد تغییر المتن مطلقاً ولا الاختصار منہ بالنقص، ولا ابدال اللفظ المرادف باللفظ المرادف لہ الا لعالم بمدلولات الالفاظ۔ یعنی متن حدیث کے الفاظ میں عمداً تبدیلی کرنا یا اختصار کرنا جائز نہیں ہے اور نہ ایک ہم معنیٰ لفظ کو دوسرے ہم معنیٰ لفظ سے بدلنا جائز ہے۔ ہاں یہ کام اسی کے لئے جائز ہو سکتا ہے جو الفاظ کے معانی و مطالب سے بخوبی واقف اور باخبر ہو۔ شرح نخبۃ الفکر۔ نیز تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو شرح صحیح مسلم مقدمہ امام نووی و فتح المغیث شرح الحدیث العراقی صہ ۵

۳- اگر اہل علم اور ماہرین لغت کے لئے بھی روایت بالمعنیٰ کی اجازت نہ ہو تو ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ بھی حرام قرار پاتا ہے اور ترجمانی بھی ناجائز ٹھہرتی ہے، حالانکہ اس بارے میں اہل علم کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ صحابۂ کرامؓ نے متعدد مواقع پر غیر عربی لوگوں سے ترجمانی کے واسطے سے گفتگو کی ہے اور اسلام کا پیغام پہنچایا ہے۔

سردست انہی دو شبہات کے جوابات پر اکتفا کی جاتی ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین۔

بقیہ اسلام میں نظام عائلی کی بنیادیں

يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ (مومن: ۱۹)

وہ آنکھوں کی خیانت کو جانتا ہے اور جو باتیں سینوں میں پوشیدہ ہیں ان کو بھی۔

اسلام نے گھروں میں داخل ہونے کے بھی آداب مقرر کئے۔ جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ صرف اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ ان کا مقصد گھریلو زندگی میں برائیوں کے پھیلنے میں رکاوٹ پیدا کرنا ہے۔ مثلاً عورت سے غیر محرم اقرباء کے علاوہ دوسرے لوگوں کے ملنے کی ممانعت کر دی ہے۔ اس ممانعت کے نتیجہ میں شیطان خاوند کے دل میں بیوی سے ملنے والوں کے بارے میں وسوسے پیدا نہیں کر سکتا۔ یہ تمام پابندیاں اسی غرض سے ہیں کہ گھر کی فضا میں شرافت اور سکھ چین بڑھے۔ اور قطع تعلقات، جھگڑے، بدکرداری، شکوک و شبہات اور بہتان بازیوں کی نوبت نہ آئے۔ (المسلمون)

عائلی کمیشن رپورٹ پر تبصرہ

عائلی مسائل مثلاً طلاق۔ تعدد ازواج وغیرہ پر مولانا امین احسن اصلاحی کی تحقیقی اور معرکۃ الآرا تصنیف۔

قیمت دو روپے پچیس پیسے (علاوہ محصولڈاک)

ملنے کا پتہ:- مکتبہ میثاق۔ رحمان پورہ۔ اچھرہ۔ لاہور ۱۲

افادات فراہیؒ

جناب خالد مسعود صاحب

اصولِ تفسیر

(۴)

تاویل قرآن بالقرآن نظم کلام کے بعد تفسیر قرآن کا دوسرا بنیادی اصول تاویل قرآن بالقرآن ہے۔ یعنی یہ کہ قرآن کے ایک مقام کا مفہوم دوسرے مقامات کی مشابہ یا مقابل آیات کی روشنی میں متعین کیا جائے۔ اس اصول کا ذکر علامہ سیوطیؒ نے اتقان میں یوں کیا ہے۔

"علماء نے کہا ہے کہ جو شخص کتاب عزیز کی تفسیر کرنا چاہے، اس کو چاہئے کہ وہ سب سے پہلے قرآن کی تفسیر قرآن سے کرے۔ قرآن میں جو چیز ایک جگہ مجمل ہے وہی چیز دوسری جگہ شرح و بسط کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ ابن جوزیؒ نے خاص اس عنوان پر ایک کتاب لکھی ہے جس میں قرآن کے ان مطالب سے بحث کی ہے جو ایک جگہ مجمل ہیں اور دوسری جگہ مفصل۔ میں نے بھی مجمل کے باب میں اس کی بعض مثالوں کی طرف اشارہ کیا ہے"

قرآن مجید کا ایک عام اسلوب یہ ہے کہ وہ ایک ہی مسئلہ کے بعض پہلو ایک موقع پر بیان کر دیتا ہے لیکن دوسرے پہلو مجمل چھوڑ دیتا ہے۔ یہ مجمل پہلو کسی دوسرے مقام پر بیان ہو جاتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر تفصیل میں پڑے بغیر نفس کلام ہی سے مجمل بات کے معنی سمجھ میں آجاتے ہیں۔ مثال کے طور پر سورۃ انفال کے آخر میں آتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا — جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی

وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
اور خدا کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرتے رہے۔

اس سے ذرا آگے یہ آیت آئی ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
اور جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور خدا کی راہ میں جہاد کرتے رہے

یہاں بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ کے الفاظ نہیں آئے مگر وہ بھی لازماً مراد ہیں۔ یہاں سے اور آگے چل کر یہ آیت آئی:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا مَعَكُمْ
اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور تمہارے ساتھ ہو کر جہاد کرتے رہے۔

یہاں نہ فی سبیل اللہ کہہ کر تفصیل کی اور نہ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ کی قید لگائی حالانکہ مفہوم میں یہ دونوں شامل ہیں اور اس پر دلیل مَعَكُمْ (تمہارے ہمراہ) کا لفظ ہے۔

تاویل بالقرآن کا باب ایک وسیع باب ہے اور بڑے معانی کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

مثال کے طور پر سورہ بقرہ کے شروع میں آیا:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۡ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ
جو لوگ کافر ہیں انہیں تم ڈراؤ یا نہ ڈراؤ ان کے لئے برابر ہے۔ وہ ایمان لانے کے نہیں۔ خدا نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔ اور ان کے لئے بڑا عذاب ہوگا۔

یہاں الذین کفروا کا مفہوم ہم نے یہ سمجھا کہ جنہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کی صفاتِ عدل کا انکار کیا اور اس کے نتیجہ میں انہوں نے جزا و سزا کو نہ مانا لَا يُؤْمِنُوْنَ سے ہم نے یہ مراد لی کہ وہ لوگ اس کتاب پر ایمان لانے والے اور اس سے راہ یاب ہونے والے نہیں ہیں۔ اس مفہوم کے لینے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے یہ آیت گزر چکی ہے،

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ
یہ کتاب ہے جس کے آسمانی ہونے میں کوئی شک نہیں۔ ہدایت ہے متقیوں کے لئے جو غیب میں رہتے ہوئے ایمان لاتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ الذین کفروا سے مراد وہ لوگ ہیں جو ان مومنین بالغیب کی ضد ہوں۔ اس کے بعد مومنین کی نمایاں خصوصیت کا بیان ہے اور آخر میں آتا ہے۔

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۤ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ
یہی لوگ اپنے پروردگار کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی نجات پانے والے ہیں۔

اس کے بعد ان مومنین کے مخالف گروہ کا ذکر ہوا۔ یہ تاویل اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مبتدا و خبر میں فرق ہونا ضروری ہے۔ پھر ہم نے سیاق پر غور کیا تو وہ چیز پائی جو مفہوم کو کھول دیتی ہے۔ اس کے بعد ہم نے اس آیت کے نظائر تلاش کئے تو ہم نے ان کو اس مفہوم کا مؤید پایا جو ہم نے سمجھا تھا چنانچہ سورہ یٰسین کے ابتدا میں اور ذیل کی آیات میں ہم نے یہی مضمون پایا:

وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ۝ وَّجَعَلْنَا عَلٰي قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓي اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا
(بنی اسرائیل ۴۵)
اور جب تم قرآن پڑھ کر سناتے ہو تو ہم تم میں اور ان لوگوں میں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے حجاب پر حجاب کر دیتے ہیں اور ان کے دلوں پر پردے ڈال دیتے ہیں کہ اسے سمجھ نہ سکیں اور ان کے کانوں میں ثقل پیدا کر دیتے ہیں اور جب تم قرآن میں اپنے پروردگار یکتا کا ذکر کرتے ہو تو وہ بدک جاتے ہیں اور پیٹھ پھیر کر چل دیتے ہیں۔

پس قرآن نے ہمیں یہ خبر دے دی کہ جو شخص خدا کے ساتھ شریک ٹھہرائے اور آخرت کا منکر ہو وہ نہ قرآن کو سنتا ہے اور نہ اسے سمجھتا ہے۔ بلکہ وہ قرآن سے متنفر ہوتا ہے۔

تاویل بالقرآن کی مثالیں

تفسیر قرآن بالقرآن کے اس اصول کی وضاحت ہم متعدد مثالیں دے کر کریں گے۔

۱۔ قوم لوط کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ (ذاریات ۳۳) (مٹی کے پتھر) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور دوسری جگہ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ (ہود ۸۲) (سنگ گل کے پتھر) آیا ہے جو اول الذکر کی وضاحت کر رہا ہے۔

۲- نماز استعانت باللہ کے ہم معنی ہے۔ اس حقیقت تک ہم اس طرح پہنچے ہیں کہ حضرت موسیٰ نے اپنی قوم کو حکم دیا:

اِسْتَعِیْنُوْا بِاللّٰہِ وَاصْبِرُوْا (اعراف ۱۲۸)
اللہ سے مدد چاہو اور ثابت قدم رہو۔

دوسری جگہ بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا۔

اِسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ (بقرہ ۴۵)
مدد چاہو صبر سے اور نماز سے۔

۳- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ (مومن ۵۵)
پس صبح و شام اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرو۔

یہ آیت نماز کے بعض اوقات کی تعیین کرنے میں واضح ہے۔ اس کی تفسیر دوسرے نظائر سے ملتی ہے۔ چند آیات ملاحظہ ہوں:

ا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَأَدْبَارَ السُّجُوْدِ (ق ۴۰)
اور طلوع آفتاب سے قبل اور اس کے غروب سے قبل اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے رہو اور رات کے بعض حصوں میں اور ستاروں کے ڈھل جانے پر بھی اس کی تسبیح کرو۔

ب فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَإِدْبَارَ النُّجُوْمِ (طور ۴۹)
اور جب تم اٹھا کرو تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرو اور رات کے بعض حصے میں اور ستاروں کے ڈھل جانے پر بھی اسی کی تسبیح کرو۔

ج فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَعَشِيًّا وَحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ (روم ۱۸)
تو جس وقت تم کو شام ہو اور صبح ہو تو اللہ کی تسبیح کرو، آسمانوں اور زمین میں اسی کی حمد ہے اور شام کے وقت اور جب ظہر ہو۔

د فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ
پس جو کچھ یہ لوگ کہتے ہیں اس پر صبر کرو اور سورج کے نکلنے سے پہلے اور اس کے غروب

وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا وَمِنْ آنَاءِ اللَّيْلِ فَسَبِّحْ وَأَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى (طٰہٰ ۱۳۰)
سے قبل اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ تسبیح کرو اور رات کے اوقات میں اور دن کی اطراف کے وقت بھی تسبیح کرو تاکہ تم نہال ہو جاؤ۔

(۲) وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ اللَّيْلِ (ہود ۱۱۴)
اور نماز قائم کرو دن کے دونوں سروں اور رات کی چند ساعات میں۔

(۳) أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ إِلٰى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ (بنی اسرائیل ۷۸)
سورج کے ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک نمازیں قائم کرو اور صبح کو قرآن پڑھو۔

۴- ایک ذرا گہری مثال یہ ہے کہ فرمایا:

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ (ملک ۲)
اس نے موت اور زندگی پیدا کی تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون اچھے عمل کرتا ہے اور وہ غالب بخشنے والا ہے۔

موت تنبیہ اور نصیحت کرنے والی ایک چیز ہے لیکن زندگی لذتوں سے بھرپور ہے۔ جہاں تک آزمائش کا تعلق ہے وہ موت و حیات دونوں کے ذریعہ ہو رہی ہے۔ اگر خواہشات نہ ہوتیں تو لوگ حق سے غافل ہونے اور نہ اس سے پھرتے۔ اور اگر موت نہ ہوتی تو وہ بدعملی سے باز آتے اور نہ زندگی بعد موت کے لئے اپنے آپ کو تیار کرتے۔ مجھے آیت کی اس تاویل کی طرف پہلے از خود رہنمائی ہوئی، پھر اس کی ایک نظیر بھی میری نگاہ سے گزری۔ وہ یہ آیت ہے۔

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا وَإِنَّا لَجَاعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا (کہف ۸)
جو چیز زمین پر ہے ہم نے اس کو زمین کے لئے آرائش بنایا ہے تاکہ لوگوں کی آزمائش کریں کہ کون ان میں اچھے عمل کرنے والا ہے اور جو چیز زمین پر ہے ہم اس کو بنجر میدان کر دیں گے۔

اگر غور کرو تو اس آیت کے پہلے حصے میں ذہنی پہلو اور دوسرے میں خارجی پہلو کا ذکر ہے

۵ - قرآن نے ذیل کی آیت میں کائنات کی تخلیق سے معاد پر استدلال کیا ہے:

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيٰتٍ لِأُولِي الْأَلْبَابِ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَقُعُودًا وَعَلٰى جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (آل عمران)

بیشک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کے بدل بدل کر آنے جانے میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں جو کھڑے اور بیٹھے خدا کو یاد کرتے اور آسمان اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے ہیں کہ اے پروردگار تو نے اسے بے مقصد نہیں پیدا کیا۔ تو پاک ہے۔ تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچائیو۔

یعنی اگر کائنات بے مقصد نہیں بنائی گئی تو حکمت و قدرت والے خدا کے سوا یہ کس کی تخلیق ہو سکتی۔ پھر اس کا بے مقصد ہونا کیسے ممکن ہے جب کہ اس کے عجائبات بے شمار ہیں پھر انسان جو اس کائنات کی شریف ترین مخلوق ہے، اس کا بے مقصد پیدا ہونا بالکل خلاف عقل ہے۔ اس کا یہ ایک لازمی نتیجہ ہے کہ ایک دن آئے جب فیصلہ کیا جائے اور اس کے مطابق بدلہ دیا جائے۔ اس استدلال کے بعد ایک غور و فکر کرنے والے انسان کی زبان سے خدا کی جلالت و عظمت اور اس کی حکمت و رحمت کو یاد کر کے سبحٰنک (تو پاک ہے) کا لفظ نکلتا ہے اور خدا کی حکمت سے جو جزا لازم آتی ہے، اس کے تصور سے نیک فطرت انسان فقنا عذاب النار (پس ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا) پکار اٹھتا ہے۔

اس استدلال کی نظیر خدائے قدوس کے اس ارشاد میں ملتی ہے۔

أَوَلَمْ يَنْظُرُوا فِي مَلَكُوتِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ وَأَنْ عَسٰى أَنْ يَكُونَ قَدِ اقْتَرَبَ أَجَلُهُمْ فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ (اعراف ۱۰۵)

کیا انہوں نے آسمان اور زمین کی بادشاہت میں اور جو چیزیں خدا نے پیدا کی ہیں ان پر نظر نہیں کی اور اس بات پر خیال نہیں کیا کہ عجب نہیں ان کا وقت نزدیک پہنچ گیا ہو تو اس کے بعد وہ اور کس بات پر ایمان لائیں گے۔

یعنی کیا ان لوگوں نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیز بھی پیدا کی ہے حکمت کے ساتھ پیدا کی

ہے اور ایک غایت ہے جو اس کی تخلیق کے ساتھ وابستہ ہے۔ لہذا اس کے لئے لازماً ایک مدت مقرر ہونی چاہئے۔ چنانچہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ رات آتی ہے اور اس کے بعد دن نمودار ہو جاتا ہے موسم تبدیل ہوتے ہیں، قوموں کی زندگیوں میں تبدیلیاں آتی ہیں جب ایک قوم اٹھتی ہے تو دوسری رخصت ہوتی ہے جیسا کہ ارشاد ہے

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ (اعراف ۳۴)

اور ہر گروہ کے لئے ایک وقت مقرر ہے جب وہ وقت آجاتا ہے تو نہ تو ایک گھڑی دیر کر سکتے ہیں نہ جلدی۔

لہذا کیا یہ ممکن نہیں کہ ان مخاطب مشرکین کی اجل بھی قریب آ چکی ہو۔ اس موقع پر تم دیکھو گے کہ تخلیق عالم سے معاد پر استدلال جو پہلے موقع پر مخفی رکھا گیا یہاں اس کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

اس کی مزید تفصیل ایک تیسرے موقع پر ملتی ہے۔ سورہ ق میں ارشاد ہے

بَلْ عَجِبُوا أَنْ جَاءَهُمْ مُنْذِرٌ مِنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُونَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيبٌ ءَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌ بَعِيدٌ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْأَرْضُ مِنْهُمْ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيظٌ بَلْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ فَهُمْ فِي أَمْرٍ مَرِيجٍ (ق ۲ - ۵)

نہیں بلکہ ان لوگوں نے تعجب کیا کہ انہی میں سے ایک ڈرانے والا ان کے پاس آیا تو کافر کہنے لگے کہ یہ بات تو عجیب ہے۔ بھلا جب ہم مر گئے اور مٹی ہو گئے تو پھر زندہ ہوں گے یہ زندہ ہونا بعید از عقل ہے۔ ان کے جسموں کو زمین جتنا کم کرتی جاتی ہے ہمیں معلوم ہے اور ہمارے پاس محفوظ کتاب ہے۔ بلکہ جب ان کے پاس حق آ پہنچا تو انہوں نے اسے جھٹلایا سو یہ الجھے میں پڑے ہوئے ہیں

یعنی ایک شدنی امر میں شک کرتے ہیں۔ یہ شدنی امر جزا و سزا اور معاد کا ہے جیسا کہ آگے وضاحت کر دی اور اس کی دلیل بھی بیان فرمائی۔

أَفَلَمْ يَنْظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوجٍ وَالْأَرْضَ مَدَدْنٰهَا

کیا انہوں نے اپنے اوپر آسمان کی طرف نگاہ نہیں کی کہ ہم نے اس کو کیونکر بنایا اور سجایا اور اس میں کہیں شگاف نہیں۔ اور زمین کو ہم نے پھیلایا اور اس میں پہاڑ رکھ

وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْبَتْنَا فِيْهَا	دیئے اور اس میں ہر طرح کی خوشنما چیزیں
مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيْجٍ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى	اگائیں تاکہ رجوع لانے والے بندے
لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ (ق ۶ - ۸)	ہدایت اور نصیحت حاصل کریں۔

یعنی خدا کی حکمت و قدرت کے یہ مظاہر اپنی خوبیوں اور عظمتوں سے ہر جھکنے والے انسان کی آنکھیں کھولتے اور اس کے دل کو متنبہ کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ کائنات کی صنعت کو دیکھ کر صانع کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس کی رحمت کا اقرار کرنے لگتا ہے آگے اس کی وضاحت بھی فرمادی گئی

وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا	اور ہم نے آسمان سے برکت والا پانی اتارا اس
فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ	سے باغ اگائے اور کھیتی کا اناج اور لمبی لمبی
الْحَصِيْدِ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ	کھجوریں جن کے خوشے تہ بہ تہ ہوتے ہیں۔ بندوں
لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ	کے رزق کے لئے۔ اور اس پانی سے ہم نے
وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذٰلِكَ	مردہ زمین کو زندہ کیا۔ بس اسی طرح قیامت
الْخُرُوْجُ (ق ۹ - ۱۱)	کے دن اٹھنا ہے۔

اب غور کرو تو معلوم ہوگا کہ سورہ ق کی ان آیات میں کائنات کے ان دلائل کی تفصیل بیان کی گئی ہے جن کی طرف پہلے اور دوسرے مقام پر محض اشارہ کافی سمجھا گیا تھا۔ لیکن پہلے موقع پر کائنات کے مشاہدہ کے بعد انابت اور فکر و تدبر کی جو تفصیل پیش کی گئی تھی اسے سورہ ق کی آیات میں ترک کر دیا گیا ہے ان مثالوں سے تاویل بالقرآن کا مطلب واضح ہوگیا ہوگا۔ قرآن نے اپنی یہ صفت خود بیان کی ہے فرمایا

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا	اللہ نے اچھا کلام نازل فرمایا ہے یعنی کتاب جس
مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ	کی آیتیں ملتی جلتی اور مثانی ہیں۔

قرآن کو مثانی بنانے کا مطلب یہی ہے کہ وہ ایک مسئلہ کو بار بار پیش کرتا ہے۔ لیکن مختلف مواقع پر مسئلہ کے بعض پہلوؤں کو مشابہ کر دیتا ہے۔ چنانچہ ایک شبیہ سے دوسری شبیہ کی طرف عقل منتقل ہوتی ہے اور ان پہلوؤں کا احاطہ بھی کر لیتی ہے۔ جو وہاں بیان نہیں ہوتے لیکن دوسرے مشابہ مقام پر موجود ہوتے ہیں۔ قرآن مجید کے قصوں میں یہ خصوصیت بڑی کثرت سے ملتی ہے۔

تاویل قرآن بالقرآن کے اصول

(۱) اگر ایک کلمہ یا جملہ دو تاویلوں کا محتمل ہو اور نظائر بھی دونوں تاویلوں کے حق میں ہوں تو اس صورت میں ایک ہی تاویل مراد نہ لی جائے گی، جب تک دونوں میں وہ راجح تاویل نہ ہو۔ جب راجح تاویل کے نظائر زیادہ ہوں تو نظائر کی کثرت ہی اس کے صحیح ہونے کی دلیل ہوگی ورنہ دونوں تاویلیں مساوی قرار پائیں گی۔ اس اصول کی مثال لفظ قرآن کی تاویل ہے۔ قرآن کے معنی جمع شدہ کے بھی ہیں اور پڑھی جانے والی کے بھی۔ لیکن اول الذکر معنی کے مطابق تاویل صحیح نہ ہوگی کیونکہ جب نظائر کا استقصاء کیا جائے تو مؤخر الذکر مفہوم تمام مواقع پر ٹھیک بیٹھتا ہے بلکہ بعض مقامات پر وہی راجح ہے جب کہ پہلا مفہوم بعض جگہ بالکل مراد نہیں۔

۲۔ جب ایک کلام مختلف تاویلات کا حامل ہو تو ان میں سے جس تاویل کی نظیر قرآن میں ملے گی وہ زیادہ قابل اعتماد ہوگی کیونکہ یہ ممکن ہے کہ جس تاویل کی نظیر قرآن میں نہیں وہ محض رائے اور سراسر گمراہی ہو۔ جس تاویل کی نظیر حدیث میں ملتی ہے اس کو اختیار کرنے سے پہلے اس حدیث کو بھی روایت و درایت کے معیار پر پرکھنا ضروری ہے۔ وہ تاویل جس کی نظیر قرآن میں ہو زیادہ مضبوط ہے۔

شاذ معنی متروک ہیں

تفسیر قرآن کا تیسرا بنیادی اصول یہ ہے کہ قرآن مجید کے کسی لفظ کے ایسے معنی مراد نہیں لئے جائیں گے جو لغت میں شاذ ہوں اور باقی قرآن سے موافقت نہ رکھتے ہوں۔ ہم اس اصول کو محض مرجح اصول نہیں سمجھتے کیونکہ بسا اوقات کسی عام ظاہر لفظ کے بجائے کلام میں کوئی اچھا محفوظ لفظ استعمال کر لیا جاتا ہے لیکن جب بھی ایسا لفظ استعمال ہوتا ہے لازم ہے کہ وہ اپنے معلوم و ثابت مفہوم ہی پر دلالت کرے۔ اگر اس لفظ سے مراد کوئی ایسا مفہوم لیا جائے جس سے عام لوگ واقف نہ ہوں اور ایک مدعی محض اس کا دعویٰ ہی کرتا ہو اس کے پاس اس کے ثابت کرنے کی کوئی دلیل نہ ہو تو یہ ایک معما بازی ہوگی حالانکہ قرآن مجید کو خدا نے عربی مبین میں نازل فرمایا ہے جب حقیقت یہ ہے تو وہ اس میں فصاحت کو کیوں ملحوظ نہ رکھے گا۔ جہاں تک قرآن مجید کے عالی مطالب کا تعلق ہے وہ اس ذیل میں نہیں آتے کیونکہ ان کا کلام اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہوتا ہے اور وہ عالی مضامین انہی الفاظ میں مضمر ہوتے ہیں جن میں کوئی تضاد و تناقض نہیں ہوتا۔

اس اصول کی وضاحت کے لئے ذیل کی مثالوں پر غور کرو۔

۱۔ سورۂ تحریم کی آیت ہے۔

فَإِنْ تَتُوبَا إِلَى اللَّهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا

پس اگر تم دونوں خدا کی طرف رجوع کرو تو یہ اقرب ہے کیونکہ تمہارے دل تو مائل ہی ہو چکے ہیں۔

یہاں صغو کے معنی میل الی الشئ (جھکنا) کے ہیں لیکن باطل پسندوں نے اس کے معنی پھیر کر زیغ (گمراہ ہونا) کا مفہوم لینے کی کوشش کی۔ اس طرح انہوں نے ازواج مطہرات کو مطعون کیا۔ انہوں نے اپنی اس باطل تاویل کے لئے ایک جھوٹی قرأت بھی وضع کی مگر اسے تواتر کا درجہ حاصل نہ ہو سکا۔

۲۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۶۰

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ

اللہ نے مومنوں پر احسان فرمایا جب ان کے اندر انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا

کے تحت کسی کا قول یہ ہے کہ انفسھم میں فا منصوب ہے۔ یہ تاویل بالکل باطل ہے اس کی کئی وجوہ ہیں مثلاً

اوّلاً یہ معنی شاذ ہیں۔ خود قرآن میں یہ بات موجود ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی قوم میں سے تھے۔

ثانیاً یہ کہ بالکل واضح معاملہ ہے۔

ثالثاً یہ کہ رسول کا اپنی قوم میں سے ہونا کوئی عیب نہیں وہ انہی میں سے ہوتا ہے۔

رابعاً یہ کہ کلام عرب کے نظائر اس تاویل کے خلاف ہیں۔ عرب اس مفہوم کے لئے من خیارھم اور من علیائھم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں من انفسھم نہیں کہتے۔

خامساً یہ کہ خدا کا احسان اسی شکل میں زیادہ ہوتا ہے جب رسول اپنی قوم ہی میں سے مبعوث ہو۔

سادساً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا یہی تھی کہ اللہ تعالیٰ اسی قوم کے ایک فرد کو نبوت پر سرفراز کرے۔

جن لوگوں نے یہ غلط تاویل اختیار کی وہ دراصل اس کو آیت مباہلہ کی ایک غلط تاویل کے لئے سند کے طور پر استعمال کرنا چاہتے تھے۔ (باقی بر صفحہ ۴۸)

اقتباسات و تراجم

جناب خالد مسعود صاحب

اسلام میں نظامِ عائلی کی بنیادیں

میثاق کے گذشتہ شمارہ میں اقتباسات و تراجم کے ذیل میں جو مضمون دیا گیا تھا اس میں تہذیبِ مغرب کے معاشرتی نظام کی ایک جھلک پیش کی گئی تھی۔ ذیل کا مضمون جو ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی کے مقالہ مبادی عامۃ فی نظام الزواج کا ترجمہ ہے اسلام کی معاشرت کی ایک تصویر ہے۔ یہ مضمون اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ عائلی قوانین اس وقت ہمارے ملک کی مسلم آبادی میں ایک نزاع بنے ہوئے ہیں اور ان کے موافق و مخالف نقطہ نظر بڑی قوت کے ساتھ سامنے آئے ہیں۔ یہ مضمون اس مسئلہ پر بھی ایک حد تک روشنی ڈالے گا۔ (ادارہ)

اسلام نے معاشرت کا ایک نہایت محکم نظام تجویز کیا ہے یہ نظام ایسی مضبوط بنیادوں پر قائم ہے جو خاندان کی بہبود، گھریلو زندگی کے سکھ چین اور معاشرہ کی بھلائی کی ضامن ہیں ہم یہاں اس نظام کی چند اہم بنیادوں کا تذکرہ کریں گے۔

اس نظام کی پہلی بنیاد یہ ہے کہ نکاح کا محرک سوسائٹی کو ایک صالح نسل دینا اور گھر میں اتنی موافقت اور آسودگی پیدا کرنا ہے کہ زوجین ایک دوسرے کے اطمینان اور تسلی کا باعث بنیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً (روم ۲۱)

اور اسی کے نشانات میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس کی عورتیں پیدا کیں تاکہ ان کی طرف آرام حاصل کرو اور تم میں محبت اور مہربانی پیدا کر دی۔

قضائے شہوت کے نکاح کا ایک مقصد ہونے سے اسلام انکار نہیں کرتا کیونکہ یہ معاملہ بالکل طبعی ہے مگر وہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ نکاح کا واحد مقصد یہی سمجھ لیا جائے۔ اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حسین لیکن بانجھ عورت پر ایک سیاہ فام مگر بچے جننے والی عورت کو فضیلت دی۔ طبرانی کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا سوداء ولود خیر من حسناء لا تلد۔ حضور نے نکاح کے اس مقصدِ اولین کی تصریح یوں فرمائی۔

تناکحوا تکثروا فانی مباہ بکم الامم (نسائی وابوداؤد)	نکاح کرو اور اولاد بڑھاؤ میں دوسری امتوں پر تمہاری وجہ سے فخر کروں گا۔

نکاح سے جو دلی راحت اور گھریلو زندگی کی برکات مطلوب ہیں، ان پر سورہ بقرہ کی اس آیت سے زیادہ روشنی ڈالنے والی کوئی چیز نہیں ہے۔ فرمایا

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ	وہ تمہارا لباس ہیں اور تم ان کے لباس ہو۔

غور کیجئے کہ یہ تعبیر کتنی نازک اور اس کی دلالت کتنی گہری ہے۔ جس طرح انسان لباس کی حاجت رکھتا ہے اور یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں، اسی طرح مرد اور عورت ایک دوسرے کے حاجت مند اور لازم و ملزوم ہیں۔ مزید برآں جس طرح انسان لباس سے زینت حاصل کرتا اور اس کے ذریعے سردی و گرمی کی تکالیف اور فقر و برہنگی کی مصیبتوں کو دور کرتا ہے اسی طرح زوجین ایک دوسرے سے زینت پاتے اور تجرد اور اخلاقی انحطاط کے خطرات اور بے حیائی اور انتشار کی قباحتوں کو دور کرتے ہیں۔ قرآن نے نہایت عمدہ اسلوب سے اس حقیقت کی تعبیر کی ہے۔

اس نظام کی دوسری بنیاد یہ ہے کہ گھر کی خیر و برکت، اولاد کی نجابت اور معاشرہ میں حسنِ کردار کے پیدا ہونے کا انحصار اس بات پر ہے کہ تمام جوڑے ایک دوسرے کو اچھی طرح منتخب کریں۔ یہ انتخاب کسی فوری جذبہ، کسی وقتی مصلحت یا کسی غیر پائیدار منفعت یا لذت سے متاثر ہو کر نہ کیا جائے کیونکہ ایسے نکاح کی صورت میں زوجین میں محبت کی چنگاریاں جلد بجھ جاتی ہیں اور ان کا تعلق کمزور پڑ جاتا ہے۔ اس کے بجائے نکاح کی بنیاد ایسی پائیدار محبت اور جذبہ پر ہونی چاہیئے جو زوجین کی عمر اور ان کے نکاح کی مدت کے ساتھ ساتھ

مضبوط تر ہو۔

جو انتخاب خاوند یا بیوی کے مال کے پیشِ نظر ہوتا ہے اس میں زوجین کے مابین محبت کے بقا کی ضمانت نہیں ہوتی کیونکہ جب مال باقی نہ رہے تو وہ بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے جس پر محبت قائم تھی۔ اس کے علاوہ مالدار آدمی میں تکبر و غرور بھی ہوتا ہے۔ ایسے دو دلوں میں محبت کیسے پیدا ہو سکتی ہے جن میں سے ایک اپنے آپ کو عزت و فضیلت میں دوسرے سے فائق سمجھتا ہو!

جس انتخاب کی بنیاد حسن و جمال پر ہوتی ہے، اس میں زوجین کی محبت اسی تیزی سے گزرتی ہے جس تیزی سے عمر کے ساتھ جمال رخصت ہوتا اور رونق شباب ختم ہوتی ہے۔

اگر نکاح کی بنیاد معاشرہ میں کسی کے مرتبے پر ہو تو جونہی یہ مرتبہ زائل ہو جائے اور پہلی سی حالت باقی نہ رہے، گھر کا سکھ چین ختم ہو جائے گا۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ زوجین کی زندگی بھر یہ مرتبہ باقی رہتا ہے، جب بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے دو شخصوں میں محبت اور اطمینان کی کیفیت کیسے پیدا ہو سکتی ہے جن میں سے ایک شخص اپنے آپ کو اونچا اور باعزت سمجھتا ہو اور دوسرے کو اپنے سے چھوٹا اور ذلیل سمجھتا ہو۔

اس سے یہ واضح ہوا کہ مال و منال، حسب و نسب یا حسن و جمال کی بنا پر جو نکاح ہوا ہو وہ اس بات کی ضمانت نہیں ہوتا کہ زوجین کی زندگی محبت کے ساتھ بسر ہو گی۔ پائیدار محبت کے لئے کسی ایسی بنیاد کی ضرورت ہے جو کبھی زائل نہ ہو اور مرورِ زمانہ کے ساتھ وہ مضبوط سے مضبوط تر ہو۔ ایسی بنیاد صرف دین و اخلاق مہیا کرتا ہے۔ دین شباب کی نسبت بڑھاپے میں مضبوط ہوتا ہے اور اخلاق مرورِ زمانہ اور زندگی کے تجربات کے ساتھ درست ہوتے چلے جاتے ہیں۔ پس جب کوئی شخص اپنے ساتھی کی تلاش ایک ایسی بنیاد پر کرتا ہے جو زمانے کے ساتھ مضبوط ہوتی اور عمر کے ساتھ بڑھتی ہے تو یہ ان کی محبت کی پائیداری اور دوام کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ مسلمانوں کے ان گھرانوں میں جہاں اسلامی اخلاق و تعلیمات کارفرما ہیں زوجین کو نہ ایک دوسرے سے خیانت کا اندیشہ ہوتا ہے اور نہ دوسرے کی تبدیلی یا ناپسندیدگی کا خطرہ۔ شوہر اسّی سال کا ہوتا ہے اور بیوی ساٹھ ستر کے پیٹے ہیں۔ اس کے باوجود وہ ایک

دوسرے کے اسی طرح مشتاق نظر آتے ہیں جیسے شباب کے عالم میں تھے۔ ہم اپنے والدین میں اسی محبت و تعلق کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ہمارے علم میں یہ بات نہیں آئی کہ دیندار گھروں میں گھریلو خیانت، خاندانی جھگڑوں یا باہمی نفرت کی اتنی کثرت ہو جس سے جھوں کے افتراق تک نوبت آئے۔

پس واضح ہوا کہ صرف ایک بنیاد ایسی ہے جس کو اختیار کر کے زوجین کو اپنی زندگی کا ساتھی چننا چاہیئے۔ یہ بنیاد نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ارشادات میں یوں فرمائی ہے۔

تنکح المرأة لاربع لمالها ولجمالها ولحسبها ولدينها فاظفر بذات الدين (متفق عليه)

عورت سے چار چیزوں کی بنا پر نکاح کیا جاتا ہے، اس کے مال، اس کے حسن، اس کے خاندان اور اس کے دین کی وجہ سے۔ تم دین رکھنے والی عورت کو حاصل کرو۔

محض حسن و جمال کی بنا پر نکاح کرنے سے یوں روکا گیا۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اياكم وخضراء الدمن. قالوا وما خضراء الدمن يا رسول الله قال المرأة الحسناء في منبت السوء

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوڑے کی سبزی سے بچو۔ لوگوں نے پوچھا: یا رسول اللہ کوڑے کی سبزی سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ حسینہ جو برے ماحول میں پلی ہو۔

مال و منال اور حسن و جمال کی بنیاد پر کئے گئے نکاح کے انجام سے آپ نے اس طرح خبردار کیا۔

لا تزوجوا النساء لحسنهن فعسى حسنهن ان يرديهن ولا تزوجوهن لاموالهن فعسى اموالهن ان تطغيهن ولكن تزوجوهن على الدين ولامة سوداء ذات دين افضل (ابن ماجه)

عورتوں سے ان کے حسن کی وجہ سے نکاح نہ کرو کیونکہ عین ممکن ہے ان کا حسن انہیں ہلاک کر ڈالے اور نہ ان کے مالوں کی وجہ سے بھی ان سے نکاح نہ کرو کیونکہ ممکن ہے ان کے اموال انہیں سرکش بنا دیں۔ تم عورتوں سے ان کے دین کے سبب سے نکاح کرو۔ ایک دیندار سیاہ فام (باقی لونڈی) کی ... فضیلت رکھتی ہے

اسلام کا معیارِ انتخاب نہ صرف زوجین کے مابین محبت و سلوک کا ضامن ہے بلکہ اس کے علاوہ یہ اولاد کی نجابت اس کے اخلاق کی مضبوطی اور اس کے حسن سلوک کا بھی ضامن ہے اسی لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

تخيروا لنطفكم

اولاد کے لئے اچھی عورتوں کا انتخاب کرو۔

مجھے اس بیٹے کا جواب بہت پسند آتا ہے جس نے اپنے باپ کے اس طعنے کے جواب میں کہ وہ ایک لونڈی کے بطن سے پیدا ہوا، یہ کہا تھا: ”ابا جان، میرا خیال ہے میری ماں آپ کی نسبت زیادہ اچھی ہے۔ اس نے مجھے آپ جیسے آزاد آدمی سے پیدا کر کے اچھا انتخاب کیا جبکہ آپ نے مجھے ایک لونڈی کے بطن سے پیدا کر کے برا انتخاب کیا۔“

اسلام اپنے نظام نکاح کی تیسری بنیاد یہ بتاتا ہے کہ ہر مرد کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنی بیوی کو انسانیت کے شریفانہ مقاصد کے لئے بسانے کی رغبت کا اظہار مہر ادا کر کے کرے۔ مہر عورت کی عزت و تکریم کی محض ایک علامت ہے، اس لئے اسلام نے مہر کی بڑی رقموں کو ناپسند کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعض اصحاب کی شادی صرف اس وعدے پر کروائی کہ جتنا قرآن انہیں یاد ہے اس کی تعلیم وہ اپنی بیویوں کو دے دیں گے۔ اسی طرح ایک غریب صحابی سے فرمایا۔

التمس ولو خاتما من حديد

کچھ نہ کچھ مہر ضرور لاؤ۔ خواہ لوہے کی ایک انگوٹھی ہی ہو۔

اسلام کے نظام نکاح کی چوتھی بنیاد یہ ہے کہ نکاح کا معاہدہ ایک عام شہری معاہدہ ہے جس میں کوئی مشکلات نہیں ہیں۔ بجز ان ضروری اقدامات کے جو اس عہد کو مضبوط بنانے اور اس کے نتائج سے فرار کو روکنے کا لازمی تقاضا ہیں، تاہم اسلام نے یہ حکم دیا ہے کہ نکاح علی الاعلان ہو۔ اس پر دف بجائے جائیں، اس موقع پر خوشی کا اظہار ہو اور اعزہ و اقارب، احباب اور پڑوسیوں کو ولیمہ کی دعوت پر بلایا جائے۔ بعض علماء کے نزدیک شادی کی دعوت میں شریک ہونا واجب ہے۔ انہوں نے بلا عذر اس میں شریک نہ ہونے کو مکروہ کہا ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی شادی پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اولم ولو بشاۃ (بخاری)	ولیمہ کرو خواہ ایک ہی بھیڑ کا ہو۔

دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا

اذا دعی احدکم الی ولیمۃ	جب تمہیں ولیمہ پر بلایا جائے تو دعوت
عرس فلیجب (متفق علیہ)	قبول کرو۔

ان احکام کی وجہ یہ ہے کہ نکاح کے نتیجہ میں معاشرہ میں ایک نئے گھر کا اضافہ ہوتا ہے۔ معاشرہ کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اس طرح کے ہر شریفانہ تعلق کے موقع پر اہتمام اور سرگرمی دکھائیں۔ اس سرگرمی اور اہتمام کو دیکھ کر لازمی طور پر زوجین میں اس تعلق کو ہمیشہ باقی رکھنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور وہ اسے کمزور نہیں ہونے دیتے۔

اسلامی نظامِ معاشرت کی پانچویں بنیاد یہ ہے کہ جب نکاح کی تقریب پاکیزہ محبت کی فضا میں اور اہلِ خاندان کی خوشی کے ساتھ انجام پا چکتی ہے تو میاں بیوی دونوں خدا کے آگے ایک دوسرے کے حقوق، اس کی عزت اور اس کے رازوں کی محافظت کے جوابدہ ہو جاتے ہیں۔ ان حقوق کی اساس مرد و عورت کی مساوات ہے۔ لیکن جہاں تک گھر کی سربراہی کا تعلق ہے اس کا حق اسلام نے صرف مرد کو دیا ہے۔ یہ حق بالکل فطری طور پر مرد کو دیا گیا ہے اس کا انکار وہ قومیں بھی نہیں کرتیں جو عورت کی آزادی کا نعرہ لگانے میں پیش پیش ہیں۔ فرانسیسی قانون کے مبحث نمبر ۲۱۳ میں ہے کہ "گھر کا سردار خاوند ہے"۔ قرآن نے بھی یہی قانون دنیا کو دیا تھا۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ	اور عورتوں کا حق مردوں پر ویسا ہی ہے جیسے
بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ	دستور کے مطابق مردوں کا حق عورتوں پر ہے
(بقرہ ۲۲۸)	البتہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

کلکم راع وکلکم مسئول عن	تم میں سے ہر ایک حاکم ہے اور اپنی رعیت کے
رعیتہ ...... والرجل راع فی اھلہ	متعلق جوابدہ ہے۔ مرد اپنے گھر میں حاکم ہے اور
وھو مسئول عن رعیتہ والمرأۃ راعیۃ	اپنی رعیت کے بارے میں جوابدہ ہے عورت

فی بیت زوجھا وھی مسئولۃ	اپنے خاوند کے گھر میں حاکم ہے وہ بھی اپنی
عن رعیتھا (بخاری)	رعیت کے بارے میں جوابدہ ہے۔

اس طرح نئی ازدواجی زندگی میں عورت کی شخصیت فنا نہیں ہوتی۔ خاوند کی حیثیت عورت کی حق تلفی نہیں کرنے پاتی بلکہ عورت شادی کے بعد بھی اپنے خاندان سے نسبت رکھتی ہے اور اپنے باپ کا نام برقرار رکھ سکتی ہے۔ اسے اپنے مالی معاملات میں مکمل آزادی حاصل ہوتی ہے۔ ان معاملات میں نہ اس کا خاوند کوئی رکاوٹ ڈال سکتا ہے اور نہ اس کا باپ۔ وہ اپنی صوابدید کے مطابق خرید و فروخت یا ہبہ و دین کا حق رکھتی ہے اور دیگر مالیہ معاملات میں تصرف کر سکتی ہے۔

مالی معاملات میں تصرف کا یہ حق، جو اسلام نے عورت کو دے رکھا ہے فرانسیسی عورت کو ابھی تک حاصل نہیں ہے۔ وہاں کے قانونِ ملکی میں ۱۹۳۸ء تک عورت کو نابالغ بچوں اور بے سمجھ لوگوں کی صف میں رکھا گیا اسے یہ اختیار حاصل نہیں تھا کہ وہ اپنے مال میں خاوند کی اجازت اور اس کی موافقت کے بغیر کوئی تصرف کر سکے۔ ۱۹۴۲ء میں دوسرا قانون نافذ ہوا جس نے عورت کو ذلت کے اس گڑھے سے نکالا اور اس کا یہ حق تسلیم کیا کہ وہ اپنے ذاتی معاملات میں اپنی مرضی سے تصرف کر سکتی ہے لیکن اس اجازت کے باوجود بعض خاص معاملات کے لئے اس پر خاوند سے اجازت لینے کی پابندی لازم رکھی گئی۔ گویا اس قانون کے نفاذ کے بعد فرانسیسی عورت شخصی آزادی کے معاملہ میں مسلمان عورت سے فروتر ہے۔

یہ حقیقت کہ اسلام نے میراث میں عورت کا حصہ مرد کے حصہ کا نصف مقرر کیا ہے، اصولِ مساوات کے منافی نہیں کیونکہ تقسیمِ میراث کے اصول کی بنیاد یہ ہے کہ اسلام نے مرد کو ان باتوں کا مکلف ٹھہرایا ہے جن کا عورت کو مکلف نہیں ٹھہرایا۔ یہ بات بھی مساوات کے منافی نہیں کہ اسلام دو عورتوں کی گواہی کو ایک مرد کی گواہی کے برابر قرار دیتا ہے۔ اس حکم کی مصلحت یہ ہے کہ عورت کا حافظہ ان معاملات میں زیادہ کام نہیں کرتا جن سے اس کو عموماً سروکار نہیں ہوتا۔ عورت کو حکومت کے کاموں سے روکنے میں بھی امت کی سیاسی و اجتماعی زندگی کی مصلحت کا راز نہاں ہے۔ اسلام نے عورت کو جس کام سے بھی روکا ہے یا اس کا حصہ مرد کے حصہ سے کم رکھا ہے تو وہ انہی معاملات سے متعلق ہے جو معاشرت، حقوق اور امور واقعی سے تعلق رکھتے ہیں

یہ پابندیاں اس کی ازدواجی زندگی کی آزادی کے منافی ہرگز نہیں۔ ان کی حیثیت بالکل ویسی ہی ہے جیسے اہلِ وطن کے مساوی حقوق رکھنے کے باوجود حکومت کے ملازمین کو تجارت کرنے اور ایک سپاہی کو سیاسی پارٹیوں سے نسبت رکھنے کی ممانعت کی جاتی ہے۔

نظامِ معاشرت کے سلسلہ میں اسلام کی چھٹی تعلیم یہ ہے کہ زوجین ایک دوسرے سے وسعتِ قلب حسنِ ظن اور خوش اخلاقی سے معاملہ کریں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

خیارکم خیرکم لاھلہ (ترمذی و ابن ماجہ) — تمہارے شریف وہ ہیں جو اپنے گھر کے لئے اچھے ہیں

اگر زوجین میں منافرت کا جذبہ پیدا ہو جائے تو ایک کا جو پہلو دوسرے کو ناپسند ہو، تو اسے چاہیئے کہ اس کو برداشت کرے تاکہ گھر کے سکھ چین میں فرق نہ آئے اور تعلق ٹوٹنے نہ پائے۔ قرآن نے فرمایا۔

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِن كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا (نساء ۱۹)

اور عورتوں کے ساتھ اچھی طرح سے رہو سہو اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو عجب نہیں کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور خدا اس میں بہت سی بھلائی پیدا کر دے۔

اگر اختلاف کی خلیج وسیع ہو جائے تو ثالث کا سہارا لینے کا حکم دیا، جب ثالث بھی دلوں کی کدورت دور کرنے میں ناکام رہیں تو جھگڑے کی زندگی کا خاتمہ کرنے یا موافقت کی فضا دوبارہ پیدا کرنے کا آخری موقع مہیا کرنے کے لئے نظامِ طلاق وضع کیا۔ طلاق مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد ہوتی ہے۔ اس کا تیسرا مرحلہ جس کے بعد زوجین کا تعلق بالکل ٹوٹ جاتا ہے اس وقت آتا ہے جب فریقین میں کشیدگی اس حد تک بڑھ جائے کہ اس کا خاتمہ بجز زوجین کی علیحدگی کے ممکن ہی نہ ہو۔ اسلام اپنی اس تعلیم میں بالکل حقیقت پسند واقع ہوا ہے۔ ازدواجی الجھنیں جب زیادہ بڑھ جائیں تو اس وقت یہ سخت اقدام ہی ضروری ہوتا ہے۔ اسلام کے اس حکم سے معاشرہ زوجین کی جسمانی علیحدگی یا ازدواجی خیانت کی ان قباحتوں سے بچ جاتا ہے جن سے یورپ کی قومیں اس وقت دوچار ہوئیں، جب ان کے قوانین کے مطابق طلاق جائز نہ تھی۔

اس نظام کی ساتویں بنیاد یہ ہے کہ جس طرح اسلام زوجین کی لا علاج مخالفت کے حل

کے طور پر طلاق کی اجازت دینے میں حقیقت پسند واقع ہوا ہے، اسی طرح یہ تعدد ازدواج کو جائز رکھنے میں بھی حقیقت پسند ہے۔ تعدد ازدواج کے نقصانات کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے لیکن زندگی کی حقیقتیں ان قوانین کے زیرِ اثر بھی اسکو لازم قرار دیتی ہیں، جن میں یہ ایک امرِ ممنوع ہے۔ البتہ صورتِ حال میں فرق یہ پڑ جاتا ہے کہ اسلام تعدد ازدواج کے لئے کچھ شرائط اور حدود مقرر کرتا ہے اور تعدد کے نتیجہ میں آنے والی عورتوں کے حقوق و واجبات مقرر کرتا ہے جن کا عورت اور اس کی اولاد کے لئے پورا کرنا مرد پر واجب ہوتا ہے لیکن اس کے برعکس مذکورہ قوانین تعدد کو ناجائز سمجھتے ہوئے اسے ایک امرِ واقعی ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں مگر ان کے ہاں نہ اس کی کوئی حدود ہیں اور نہ عورتوں کے لئے حقوق پہلے سے طے ہیں بلکہ عورتوں کی عزت افزائی کا معاملہ بھی مرد کے قدموں کے نیچے ہوتا ہے۔

اسلام کا آٹھواں اصول یہ ہے کہ زوجین کے باہمی تعلقات کو استوار کرنے کے بعد یہ والدین اور اولاد کے معاملات کو منظم کرتا ہے۔

اس سلسلہ میں والدین کے لئے اس کا پہلا حکم یہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کے نام اچھے رکھیں اور برے نام رکھنے سے پرہیز کریں۔ حضورؐ کا ارشاد ہے۔

انکم تدعون یوم القیٰمۃ باسمائکم واسماء آبائکم فحسنوا اسمائکم (ابوداؤد) — قیامت کے روز تم اپنے اور اپنے باپوں کے ناموں سے پکارے جاؤ گے لہٰذا اپنے نام اچھے رکھو

دوسری حدیث میں ہے۔

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یغیر الاسم القبیح (ترمذی) — نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم برے نام تبدیل فرما دیا کرتے تھے۔

اسلام والدین کو یہ حکم دیتا ہے کہ وہ اپنی اولاد کی اچھی تربیت کریں اور انہیں ادب سکھائیں۔ آپ نے فرمایا۔

اکرموا اولادکم واحسنوا ادبھم (ابن ماجہ) — اپنی اولاد کی عزت افزائی کرو اور ان کو اچھے آداب سکھاؤ۔

جب ان میں کچھ بوجھ پیدا ہو جائے اور وہ تمیز کرنے لگیں تو ان کو نیکی کے کاموں اور اطاعت کے اعمال کی ترغیب دینے کا حکم دیا گیا۔ فرمایا۔

مروا اولادکم بالصلوٰۃ وھم ابناء سبع سنین (ابوداؤد)

جب تمہاری اولاد سات سال کی ہو جائے تو اسے نماز پڑھنے کا حکم دو۔

والدین کو تادیب اور بچوں کی سختی کے مار پیٹ کا حق بھی دیا گیا۔ البتہ مار پیٹ کے معاملہ میں یہ پابندی لگائی گئی کہ وہ ہلکی ہو، مضروب کو اس سے تکلیف نہ ہو اور چہرے یا جسم کے دوسرے نازک حصوں پر نہ مارا جائے۔

اولاد پر لازم کیا گیا کہ وہ والدین کا احترام کرے، ان کا حکم مانے اور ان کی وفادار ہو کر خدا کا قرب حاصل کرے۔ یہ حکم ان والدین کے بارے میں بھی دیا گیا جو عقیدہ میں اولاد کے مخالف ہوں البتہ اسلام نے یہ پابندی لگائی کہ والدین کے ساتھ نیکی کا معاملہ تو کیا جائے لیکن ان کے کفر و ضلال میں ان کی کوئی بات نہ مانی جائے۔ فرمایا

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا (لقمان ۱۵)

اور اگر وہ تیرے درپے ہوں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک کرے جس کا تجھے کچھ بھی علم نہیں تو ان کا کہا نہ ماننا۔ ہاں دنیا کے معاملات میں ان کا اچھی طرح ساتھ دینا۔

اسلام والدین کی نافرمانی کو کبیرہ گناہوں میں شمار کرتا ہے۔ ان کو ایذا دینے سے بھی اس نے منع کیا ہے۔ چاہے یہ ایذا باتوں سے ہو یا اُف تک کہنے سے۔ ذیل کی آیات کو دیکھئے۔ گھر کے آداب کا کیا ہی اونچا معیار اسلام نے پیش کیا ہے۔ فرمایا۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ

اور تمہارے پروردگار نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرتے رہو۔ اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اُف تک نہ کہنا اور نہ انہیں جھڑکنا اور ان سے بات ادب کے ساتھ کرنا اور عجز و نیاز سے ان کے آگے جھکے رہو اور ان کے حق میں

الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا۔ (بنی اسرائیل ۲۴)

دعا کرو کہ اے پروردگار، جیسا انہوں نے مجھے بچپن میں پرورش کیا ہے تو بھی ان کے حال پر رحم فرما۔

اس طرح اولاد اور والدین کے مابین تعلقات کو اسلام نے محبت، رعایت اور ادب کی بنیادوں پر قائم کیا ہے چنانچہ اولاد کے جوان ہونے کے بعد بھی مسلمان گھرانوں میں تعلقات ایسے ہوتے ہیں کہ اولاد کی جانب سے وفاداری اور والدین کی جانب سے شفقت و محبت کا اظہار ہوتا ہے۔

یہاں پر یہ تذکرہ بھی مفید ہوگا کہ اسلام باپ کی نسبت ماں کے ساتھ زیادہ حسن سلوک کی وصیت کرتا ہے۔ ایک آدمی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی "یا رسول اللہ لوگوں میں میری رفاقت کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟" آپ نے فرمایا "تیری ماں"۔ اس نے عرض کی "اس کے بعد کون؟" آپ نے فرمایا "تیری ماں" اس نے عرض کی "اس کے بعد کون؟" آپ نے فرمایا "تیری ماں"۔ اس نے عرض کی "اس کے بعد کون؟" آپ نے فرمایا "تیرا باپ"۔ (متفق علیہ) ایک اور آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی۔ "میں جہاد پر جانا چاہتا ہوں اور اس سلسلے میں آپ سے مشورہ لینے حاضر ہوا ہوں"۔ آپ نے فرمایا "کیا تیری ماں زندہ ہے؟" اس نے جواب دیا "جی ہاں"۔ آپ نے فرمایا۔ "تو اسی کی خدمت کر کیونکہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہوتی ہے" (ابن ماجہ)

ماں کے لئے یہ حد درجہ عنایت ہے، اس طرح اس کی شان باپ سے بھی بڑھا دی گئی ہے۔ بعض لوگوں کو اس پر بڑا تعجب ہوتا ہے حالانکہ ماں کی اس فضیلت کا سبب یہ ہے کہ جب سے بچہ کچھ سمجھنے لگتا ہے تو اسے گھر میں باپ ہی کی فضیلت نظر آتی ہے۔ وہی اسے کھلاتا پلاتا ہے، وہی کپڑے پہناتا اور تعلیم دیتا ہے۔ وہی اس پر خرچ کرتا ہے اور ادب سکھاتا ہے جہاں تک ماں کا تعلق ہوتا ہے وہ اس کی زندگی کے پہلے مرحلوں میں اس سے کہیں زیادہ بچے کی فکر کرنے والی ہوتی ہے۔ اس نے جنین اٹھایا۔ اس نے بچپن میں دودھ پلایا۔ جب بچہ بیمار ہو

تو اس نے راتیں آنکھوں میں کاٹیں۔ یہی وجہ ہے کہ بڑا ہونے کے بعد بچے کو ماں کا وہ احسان یاد دلانے کی ضرورت ہوتی ہے جو اس نے اس کے بچپن میں اس پر کیا تھا۔

اسلامی نظام معاشرت کی نویں بنیاد یہ ہے کہ جب ہم آداب کے بعد حقوق کا جائزہ لیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی عنایات دونوں فریقوں پر مساوی ہیں یہ ولایت و وصیت کے احکام سے اولاد کے لئے یتیموں کے معاملات سدھارے ہیں۔ نفقہ کے احکام سے والدین کا کفیل لڑکے کو بنایا گیا ہے، اگر وہ غنی ہو لیکن اگر وہ خود فقر و فاقہ میں مبتلا ہو تو اسلام نے اس کا حق والدین کے مال میں رکھا ہے۔ یہ بالکل اسی طرح کا حکم ہے جیسے خاوند کو اپنی بیوی کا اور آدمی کو اپنے اقرباء کا کفیل بنایا گیا ہے، اس طرح گھر کی فضا ہمدردی اور تعاون کے نتیجہ میں نہایت خوشگوار ہوتی ہے۔ میراث کے احکام مرنے والے کے مال میں گھر کے افراد کے حصّوں کو متعین کرتے ہیں۔

اسلام کے نظام معاشرت کی دسویں بنیاد وہ خدائی الہام ہے جس کے سبب سے پورے معاشرہ میں شرافت، طمانیت اور برکت کا دور دورہ ہوتا ہے اور وہ ہے زنا اور اس کی طرف لے جانے والی چیزوں کی حرمت کے سخت احکام۔

زنا اسلام میں ایک بہت بڑا جرم ہے، شادی شدہ مرد و عورت کے لئے اس کی سزا رجم کے ذریعہ موت ہے۔ یہ سزا اتنی سخت ہے کہ لوگوں کو اس بے حیائی کے ارتکاب سے روکنے میں بڑی مؤثر ہے۔ اسلام نے نہ صرف زنا کو حرام کیا ہے بلکہ اس نے لہو و لعب اور رقص و سرود کی مجلسوں میں مردوں اور عورتوں کے اختلاط کو بھی مطلقاً حرام کر دیا ہے۔ پھر آدمی کا ایک اجنبی عورت کے ساتھ خلوت میں رہنا اور محرم کی رفاقت کے بغیر عورت کا سفر کرنا بھی ممنوع ہے۔ اسلام نے انہی انتظامات پر اکتفا نہیں کی بلکہ بری نظر کو بھی حرام قرار دیا۔ چنانچہ غض بصر اور عفت نظر کا حکم دیا۔ فرمایا:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ	مومن مردوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں......
وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ (نور - ۳۰ - ۳۱)	اور مومن عورتوں سے بھی کہہ دو کہ وہ بھی اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کیا کریں

(باقی برصفحہ ۵۶)

تقریظ و تنقید

تجدید ایمان

تالیف:- صفوة الرحمان

ملنے کا پتہ:- محمد عبداللطیف رکن ادارہ اہل سنت وجماعت۔ ٹیپل پاڑہ۔ حق منزل ۴۳
لس بیلا ہاؤس۔ کراچی نمبر ۵

یہ کتاب حیدرآباد دکن کے ادارہ اہل سنت وجماعت کی طرف سے شائع کی گئی ہے اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ کی وضاحت ہے۔ مصنف نے توحید کے دلائل اور اس کی حقیقت پر سیر حاصل بحث کی ہے اور توحید کے بارے میں عام طور پر جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں ان کی تردید کرتے گئے ہیں۔ مصنف کا فکر صحیح ہے اور چند آیات کے مفہوم کے تعین کے علاوہ ہمیں ان سے کوئی نمایاں اختلاف نہیں۔ کتاب پڑھنے کے لائق ہے۔ یہ ۴۰ صفحات کی ہے اور مذکورہ بالا پتہ سے صرف محصول ڈاک ادا کر کے حاصل کی جا سکتی ہے۔

نوید مسیح

تالیف:- مرزا ریاض احمد حافظ آبادی

ملنے کا پتہ:- صداقت اسلام سوسائٹی - ۱۹ چیمبرلین روڈ - لاہور

۱۶ صفحات کے اس کتابچے میں بائبل کی ان آیات کی وضاحت کی گئی ہے جن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی پیشین گوئیاں ہیں۔ ان آیات کا مصداق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو ثابت کیا گیا ہے۔

اس کتابچہ کی قیمت ۶ پیسے ہے۔

• شانِ محمدؐ • تعارفِ بائیبل

تصنیف :۔ مولانا محمد مالک کاندھلوی تصنیف :۔ محمد اسلم رانا

شائع کردہ :۔ مرکزِ تحقیق مسیحیت ۔ سردار پورہ ۔ اچھرہ لاہور ۔

علی الترتیب ۴۰ اور ۲۴ صفحات کے یہ کتابچے ایک ایسے ادارہ نے شائع کئے ہیں جسے وجود میں آئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا اور جس کا مقصد اسلام پر عیسائیوں کے اعتراضات کی تحقیق کرنا اور اسلام کی حقانیت ثابت کرنا ہے ۔ اس ادارہ کے عہدیدار اپنے مطالعہ کے لحاظ سے عیسائیت پر گفتگو کرنے کے واقعی اہل ہیں اور وہ عیسائی مبلغین کے ساتھ ملاقاتوں ، تصنیف و تالیف اور خط و کتابت کے ذریعے سے اسلام کے حق میں مفید کام کر رہے ہیں ۔

تعارفِ بائیبل ، موجودہ بائیبل کی حیثیت کو نہایت عمدگی سے واضح کرتی ہے ۔ اس میں بائیبل کی تاریخ ، اس کے متن کے اختلافات اور خود عیسائی محققین کی تحقیقات کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا گیا ہے ۔ جس کے مطالعے سے عام قاری عیسائیت کے پائے چوبیں سے بخوبی واقف ہو جاتا ہے ۔

شانِ محمدؐ ، ایک پادری صاحب کے سوالات اور مصنف کے قلم سے ان کے جوابات پر مشتمل ہے ۔ سوالات وہی ہیں جو حضرت مسیح علیہ السلام کی برتری ظاہر کرنے کے لئے عیسائی عام طور پر کرتے رہتے ہیں ۔ فاضل مصنف کے جوابات ان کا توڑ کرنے میں کامیاب ہیں اگرچہ ان کے بعض پہلو کمزور ہو گئے ہیں ۔ جوابات میں یہ کمزوری ہمارے نزدیک بعض آیات کی مرجوح تفسیر اختیار کرنے سے پیدا ہو گئی ہے ۔ اگر ان آیات کی وضاحت میں غلطی نہ ہو گئی ہوتی تو یہ جوابات خاصے مدلل ہوتے ۔

یہ دونوں کتابچے مذکورہ بالا پتہ سے ۵۰ پیسے کے ٹکٹ بھیج کر حاصل کئے جا سکتے ہیں ۔

(خ ۔ م)

محی الدین پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر میثاق رحمان پورہ ۔ اچھرہ ۔ لاہور ۱۴ سے شائع کیا